دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبد الحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور
مغربی پاکستان
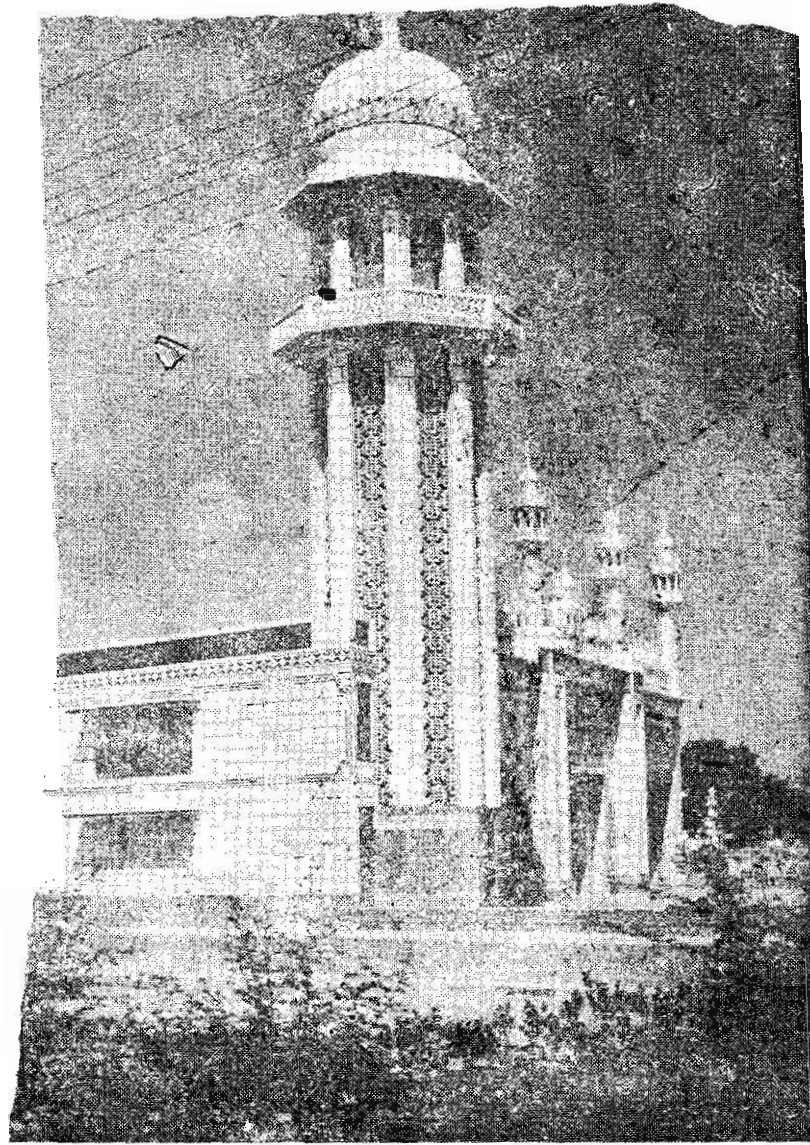
دارالعلوم حقانیہ کی مسجد کا دلکش

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

صفر المظفر ۱۳۹۰ھ
اپریل ۱۹۷۰ء

جلد : ۵
شمارہ : ۷

ماھنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر ———— سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے -/۸ روپے، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ
غیر ممالک بحری ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

صدر پاکستان نے اپنی ۲۸ مارچ کی تقریر میں آئندہ انتخابات اور قانون ساز اسمبلی کے لئے آئینی ڈھانچہ کا اعلان کرتے ہوئے اس کے اہم نکات کا جو آئندہ آئین سازی کے لئے بنیادی اصول ہوں گے اعلان کر دیا ہے۔ ان نکات میں اسلامی نظریہ کا تحفظ بھی شامل ہے۔ جہاں تک اس اہم نکتہ کا تعلق ہے، صدر صاحب کے اعلان کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے اور یہی ایک چیز ہے جس کی پوری پوری رعایت اور نگہداشت پر ملک وملت کی بقار کا دار ومدار ہے، مگر کیا نئی تشکیل پانے والی اسمبلی واقعی معنوں میں اسکی رعایت کر سکے گی اور اس کے ذریعہ ملک وملت کو قرآن وسنت پر مبنی ایک عادلانہ دستور فراہم ہو سکے گا۔؟ یہ سوال سنجیدہ غور اور گہری سوچ وبچار کا مستحق ہے انتخابی مہم کے دوران اب تک جتنے نعرے، پروگرام اور انتخابی منشور سامنے آچکے ہیں ان کی روشنی میں یہ رائے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔ کہ اسمبلی معمولی اکثریت سے بھی اسلامی نظریہ یا نظریۂ پاکستان پر مبنی آئین بنانے میں کامیاب ہو سکے گی۔ اس وقت کچھ سیاستدا اسلام اور نظریہ پاکستان کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اور کچھ لوگ غریب عوام کو ایک تصوراتی جنت دکھا دکھا کر سوشلزم یا اس کے ہمرنگ سنہری زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ اوّل الذکر طبقہ کے گذشتہ بائیس سالہ کارناموں، اسلام کے بارہ میں ان کا خام تصور اور معاندانہ روش کو سامنے رکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ اب واقعی معنوں میں ان لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس اور اسلام کی اہمیت اور ضرورت کا شعور پیدا ہوا ہو۔ اور آئندہ اگر وہ کامیاب ہوئے تو وہی پرانا سبق دہرا کر ملک وملت کو ایک بار پھر ہیجان اور اضطراب سے دوچار نہیں کریں گے۔ بلکہ پوری ایمانداری اور دیانتداری سے کتاب و سنت پر مبنی اسلامی دستور پر اتفاق کر سکیں گے۔

رہا دوسرا ذہن تو وہ بھی دعوؤں میں جو چاہے کہے اور جسطرح چاہے اپنے لادینی نعروں سوشلزم وغیرہ پر اسلام کی مہر لگائیں مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسی ارتیابی ذہنیت بھی ہرگز ہرگز ملک وملت کو اسلام کا عادلانہ معاشی ومعاشرتی نظام دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ پہلی ذہنیت نفاق اور دوسری فکری کج روی اور گمراہی کی غماز ہے۔ اور نتیجۃً اسمبلی میں جا کر ان کا اتفاق اگر ہو سکتا ہے تو اسی مغربی تہذیب اور نظامِ حیات پر جس میں صوفی وھوس اور نفس پرستی کی تسکین کا

پورا سامان موجود ہے یا پھر کسی سوشلسٹ لائحہ عمل پر اس لئے کہ وہ بھی اخلاقی اور دینی قدروں سے آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ رہا اسلام کا نعرہ تو اسکی اثر پذیری تو اس وقت قائم رہ سکتی ہے جب اُسے اس کے مکمل مفہوم اور مصداق میں لے کر تمام بیرونی اور خارجی اثرات سے قطعی آزاد رکھا جائے دنیا میں کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت تب موجود ہو سکتی ہے کہ اس چیز کی جامعیت اور مانعیت دونوں کو ملحوظ رکھا جائے اگر ایک شخص کا تصوّر اسلام کی پوری حقیقت کا احاطہ کئے ہے اور اس کی عملی زندگی اسلام کے تمام تقاضوں کو جامع ہے۔ مگر وہ اس کے ساتھ تصوّر اور عقیدہ کی حد تک غیر اسلامی نظریات کو بھی ذہن و فکر میں جگہ دیتا ہے تو اس کا اسلام جامع ہے مگر مانع نہیں یا اگر ایک شخص اپنے ذہن و فکر کو ہر بیرونی ازم سے پاک رکھتا ہے مگر خود اسلام یا اس کے کسی جزکے بارہ میں اس کا عقیدہ درست نہیں تو اس کا اسلام مانع ہے مگر جامع نہیں۔ تو نہ پہلی صورت میں ہم ایسے شخص کو مسلمان اور اس کے اسلام کو اسلام کہہ سکتے ہیں، نہ دوسری صورت میں، ایک شخص اسلام کے تمام بنیادی اصول عقیدۂ توحید و رسالت، آخرت وغیرہ پر ایمان لا چکا ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ کسی معاشرتی یا معاشی مسئلہ میں دیگر نظریات پر ایمان رکھتا ہے یا دنیا کے ہر ازم سے اُسے نفرت ہے مگر خود اسلام کے بارہ میں اس کا تصوّر ادھورا ہے۔ تو دونوں صورتوں میں ہم اس کے اسلام کو کامل اور حقیقی اسلام نہیں کہہ سکتے، گاندھی اسلام کی بہت تعریف کیا کرتا تھا مگر وہ مسلمان نہیں تھا اس لئے کہ اس کے لئے مانعیت بھی ضروری تھی، مرزا غلام احمد اسلام کا منادی بنا پھرتا تھا مگر وہ بھی مسلمان نہیں تھا، کیونکہ اس کے لئے مانعیت کے علاوہ جامعیت کی بھی ضرورت تھی اور اسلام کی حقیقت اور ماہیت کے لئے دونوں چیزیں لازمی ہیں۔

~★~

اس میں شک نہیں کہ یہاں عوام کی غالب اکثریت اسلام کو اس کے مکمل معنوں میں چاہتی ہے اور پچھلے تلخ تجربات نے بہت سے ابن الوقت مذہب بیزار لیڈروں کو بھی اس نعرہ کی اہمیّت اور افادیت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے مگر کچھ تو علاقائی اور گروہی عصبیت نے اور کچھ بے شمار نظریات اور سیاستدانوں کے سرخ و سفید نعروں کی یلغار اور [illegible] کے حسین اور سنہری وعدوں کی کیف آفرینی نے عوام کے لئے بہت مشکل بنا دیا ہے کہ وہ اپنے لئے کسی صحیح مخلص اور ایماندار قیادت کا انتخاب کر سکیں، ان حالات میں اگر بظاہر قوم ایک منتخب مجلس آئین بنانے میں کامیاب ہو بھی جائے تو استنے گوناگوں اختلافات اور نظریات کے ہوتے ہوئے پارلیمنٹ کو کسی محدود

عرصہ میں کسی اسلامی آئین پر اتفاق کرنا ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے جو قوم کے دینی مزاج اور فکری و دینی و معاشی ضرورتوں پر پورا اتر سکتا ہو۔ اگر یہی صورت سامنے آتی ہے تو واضح ہے کہ اس کے نتیجہ میں قوم کو پہلے سے زیادہ مزید بحرانی اور غیر یقینی حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور اس کے تلخ نتائج نہایت بھیانک شکل میں نمودار ہوں گے۔ اگر اس دفعہ بھی اسمبلی نظریۂ اسلام کے تحفظ پر مبنی آئین پر متفق نہیں ہو سکی تو معلوم نہیں آئندہ کب تک یہ زمین سرزمین بے آئین بن کر رہ جائے اور شاید اس کے مقدر میں پھر کبھی بھی امن و خوشحالی اور فارغ البالی نہ ہو۔

★

اس میں شک نہیں کہ اس وقت کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو واقعی معنوں میں تن من دھن کی بازی لگا کر خلافت علیٰ منہاج النبوت اور اسلام کا غلبہ دیکھنا چاہتے ہیں ایسا اسلام جو سلف کی تشریح و ترجمانی پر مبنی ہو اور جو کسی بھی خارجی اثرات اور نظریات کا منت پذیر نہ ہو مگر کیا موجودہ صورتحال میں ان کی یہ سعی انتخابی میدان میں بار آور بھی ہو سکتی ہے۔؟ اس سوال کا جواب نہ صرف پوری ملت کے دینی شعور، ملی احساسات اور جذبۂ ایمان و اخلاص کے لئے لمحۂ فکریہ ہے، بلکہ یہ سوال خود علماء حق کے باہمی افتراق اور انتشار کے لئے بھی ایک تازیانہ ہے اور بظاہر پورے ملک کی غیرت و حمیت کیلئے ایک ایسا چیلنج ہے جسے کیا عوام کیا علماء اور کیا سیاسی قائدین سب اُسے نظرانداز کر رہے ہیں۔

موقع اور حالات کی نزاکت اگر کچھ لوگوں کے احساس اور بُرے بھلے کی تمیز کو جھنجھوڑ دیتی ہے اور کتاب وسنت کی صحیح ترجمانی کے اہل دو چار افراد اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں تو موجودہ مغربی جمہوریت کے دائرہ میں وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ پیش آمدہ مسائل کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر سے ایوان کو آگاہ کر کے اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں اور قوم پر اتمام حجت کرا دیں مگر اس مغرب کے ملعون جمہوری نظام نے یہ راستہ تو یقیناً مسدود کر لیا ہے۔ کہ کسی معاملہ میں فیصلہ اکثریت کی رائے اور ووٹ پر نہیں بلکہ خیر و بھلائی اور حق پر کیا جا سکے کیا پچھلے دور میں ایسے بیشمار مواقع نہیں آئے کہ ایوان کی اکثریت کسی مخالف موقف اور استدلال کو حق اور قرین صواب سمجھتے ہوئے بھی جماعتی اور شخصی مفاد، گروہی تعصب یا نفس اور خواہشات کی وجہ سے اپنے غلط اور غیر اسلامی موقف پر ڈٹی رہی اور نتیجۃً فیصلہ ملک و ملت کے اخلاق، تمدن اور معاشرت کو نقصان پہنچانے والی بات کے حق میں ہوا۔

بلاشبہ سوشلزم کفر پر مبنی ایک فلسفۂ حیات ہے مگر مغربی جمہوریت جس شکل میں ہمارے اوپر مسلط

ہے اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیں صحیح اسلامی نظامِ حکومت بھی دے سکتی ہے ، اس بات سے کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ہم کمیونزم ، سوشلزم یا مغرب کے کسی لادینی نظام سے یہ امید وابستہ کر دیں ہمیں اسلامی دستور العمل مہیا کر دے گا اس میں شک نہیں کہ ـــــ سوشلزم کا فلسفۂ حیات ، مذہب اور دین سے قطعی ایک متصادم فلسفہ ہے مگر "جمہوریت" بھی اگرچہ وہ براہِ راست اسلام کی مدمقابل نہ بنے پھر بھی عملاً اور نتیجۃً وہ بھی اسلام کے نفاذ کی راہ میں سدِ راہ بننے والی چیز ہے ۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ بعض ثقہ اور معاملہ فہم سنجیدہ اہلِ علم اور اصحاب فہم بھی سوشلزم کی بجا طور پر مخالفت کرتے ہوئے جمہوریت کے بارہ میں مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ اس بارہ میں ان کا نقطۂ نظر یا تو محض سطحی یا پھر رواداری کا ہو جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ تو محض ایک طرزِ حکومت ہے مگر یہ سوال اپنی جگہ باقی رہ جاتا ہے کہ کیا یہ طرزِ حکومت اسلامی ہے یا کافرانہ ؟ مان لیا کہ جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے مگر کیا مسلمانوں کی زندگی سے متعلق تمام مسائل از قسم معاملات ، معاشرت ، معاش اور تمدن اس طرزِ حکومت ہی کی گرفت میں نہیں آئیں گے اور کیا اس طرزِ حکومت میں یورپ کی طرح صرف ملک اور زمین خدا کی اور حکم بجائے بادشاہ کے عوام کا نہ ہوگا ۔ ؟

اسلامی نظامِ حکومت میں زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو اسکی اثر اندازی سے باہر رہ سکے نہ اس میں دین اور سیاست کے خانے الگ الگ ہیں ۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر کسی طرزِ حکومت کا غیر اسلامی ہونا پورے نظامِ زندگی کے کافرانہ ہونے کے لئے کافی ہو گا ، اور سوشلزم اور جمہوریت میں کچھ فرق نہیں کیا جا سکے گا ۔ اور یہ ہم نے اس لئے کہا کہ یہ بات تو بالکل بے لاگ ہے ۔ کہ اسلام میں اصل حاکمیت اور فیصلہ کا حق خدا اور اس کے رسول کو ہے صرف وہی قانون سازی کا حقدار ہے مگر مغرب کے جمہوری نظام میں قانون سازی کا حق صرف عوام اور رعیت کو دیا گیا ہے مگر اسلام پوری ملت کو مل کر بھی شریعت سے متصادم کسی بات پر قانون سازی کرنے کا حق نہیں دیتا ۔ اور نہ وہ منصوص احکام اور قطعی معروفات یا منکرات کی قانونی حیثیت بدلنے پر ووٹنگ کرنے کا روادار ہے ، بخلاف اس کے جمہوریت ایک ووٹ کی اکثریت سے بھی کسی حرام اور قطعی ناجائز بات کے حق میں فیصلہ دے سکتی ہے ۔ اسلام کسی غیر مسلم کو مسلمانوں کے معاملات پر اثر انداز ہونے والے کسی مجلس میں نمائندگی کا حق نہیں دیتا ، نہ عورتوں کے نازک کاندھوں پر یہ عظیم کام ڈالنا چاہتا ہے ، جبکہ جمہوریت کسی عیسائی اور قادیانی تک کو ملک کے اہم ترین منصب وزارت ، صدارت یا عدالت عالیہ کے سب سے بڑے عہدہ چیف جسٹس پر فائز کرانے سے نہیں جھجکتی

اور وہ عورتوں تک کو ایوان میں ایک اہم حصہ دیتی ہے اسی طرح اسلام کسی منصب یا عہدہ کے لئے کسی مسلمان کا از خود اپنے آپ کو پیش کرنے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ جبکہ جمہوریت کی ساری عمارت اسی "من چو دیگرے نیست" پر کھڑی ہے۔ اسلام میں کسی عہدہ کا استحقاق ایک شخص کی ذاتی اہلیت اور صلاحیت پر ہے، اگر اس میں یہ اہلیت نہیں تو عہدہ کے قابل نہیں اور اگر اس میں یہ تمام شرائط موجود ہیں، تو وہ اسے ایک مقررہ مدت گزرنے پر بلا وجہ معزول نہیں کرتا، مگر موجودہ جمہوریت معیار استحقاق ووٹوں کی اکثریت کو قرار دیتی ہے خواہ وہ اہلیت کے لحاظ سے صفر کیوں نہ ہو۔ اسی طرح وہ ایک خاص میعاد گزرنے پر اُسے معزول کر دیتی ہے خواہ وہ عدالت اور صلاحیت کے لحاظ سے ہر طرح پورا کیوں نہ ہو۔ اس بارہ میں اسلام پوچھتا ہے کہ اگر یہ شخص نااہل ہے تو اسے حاکم کیوں بنایا گیا اور اگر اہل ہے تو اب اسے معزول کرنا کہاں کی دانشمندی ہے، اس صورت میں تو وہ ایک با اختیار حاکم نہیں بلکہ بے دست وپا محکوم بن جاتا ہے کہ مقررہ مدت گذرنے پر بلا وجہ اسے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ اسلام حکومت کو ایسا بے دست وپا نہیں بنانا چاہتا، نہ خلافت کی عظیم امانت اتنی ہلکی ہے کہ وہ اسے ملک کے ہر اہل و نااہل میں سے جس کو چاہے سونپ دے۔

پھر وہ جمہوریت جو ووٹوں کی بنیاد پر برطانیہ میں لواطت اور پاکستان میں زنا بالرضا کو سند جواز فراہم کر سکتی ہے تعدد ازدواج پر پابندی لگاتی اور خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت دے سکتی اور شراب کے پرمٹوں کا کوٹہ مقرر کر سکتی ہے، اللہ کے اٹل قانون میراث میں غیر حقدار کو حقدار بنا سکتی ہے۔ ہر شہری کو جو مذہب چاہے اختیار کرنے کی ضمانت دے سکتی ہے ایسی جمہوریت کے اسلامی ہونے کا فتویٰ لگانے والے بزرگ اس بارہ میں کیا ضمانت دے سکتے ہیں کہ کل یہی اسمبلی شراب جوا، سود جیسے قطعی محرمات کے علاوہ ملک کا پورا معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ کسی غیر اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی جرأت نہ کر سکے گی، پس اگر سوشلزم جیسا کہ واقع ہے، ایک کافرانہ نظام ہے تو ایسی جمہوریت کیوں اسلامی طرز حکومت ہے۔ اور اگر وہ لات ہے تو یہ منات کیوں نہیں۔؟

★

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نہ تو کسی صدارتی یا پارلیمنٹری نظام کو یہ حق دیتا ہے اور نہ کسی فسطائیت یا ڈکٹیٹر شپ کو کہ وہ جیسا چاہیں مسلمانوں کے معاشرت، تمدن اور معاشیات سے متعلق کسی

مسئلہ میں قانون سازی کریں، نہ وہ کسی منصوص محرمات اور قطعی منکرات یا معروفات پر رائے شماری برداشت کر سکتا ہے، بلکہ اسکی نگاہ میں کسی اسمبلی اور مجلسِ شوریٰ کی حیثیت ایک قانوندان کی ہے قانون ساز کی نہیں۔ یہ قانون دانی معاشرہ کے کسی خاص طبقہ اور کسی فرد یا جماعت کے نام الاٹ نہیں، لیکن جسطرح دنیا کے ہر قانون کے بارہ میں بولنے اور رائے دینے کا حق صرف اسی کو دیا جا سکتا ہے جو اُس قانون کی بنیادی زبان اس کے محرکات وعوامل اُس کے اسرار اور حکمتوں اور اس کی تمام فنی پیچیدگیوں سے آگاہی رکھتا ہو۔ اگر فرانسیسی زبان کے ابجد سے بھی ناواقف شخص قانون دانس کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اور انگریزی سے نابلد شخص برٹش لاء کی گتھیاں نہیں سلجھا سکتا۔ کسی ہل جوتنے والے ان پڑھ کاشتکار کو ہم تعزیرات ہند کی تشریح کا حق نہیں دے سکتے تو پھر کتاب وسنت اور اس کے استنباط اور اجتہاد کا حق بھی ہم ایسی پارلیمنٹ کو نہیں دے سکتے جسکی اکثریت اسلامی اصولِ شریعت کے مبادیات تو کیا، نفسِ اسلام کے ابجد سے بھی ناواقف ہو ایسا کرنا خدائے علیم وحکیم کے آسمانی قانون کے ساتھ ایک ایسا مذاق ہوگا جسکی نظیر زمین پر انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے ساتھ کسی بھی مذہب اور قوم میں نہیں مل سکتی۔ قانون دانی کے تمام شرائط اور تقاضوں پر پورے اترنے والے افراد بھی اگر کچھ کر سکتے ہیں تو صرف یہی کہ کتاب وسنت پر مبنی احکام وقوانین کو زندگی کے مختلف شعبوں پر لاگو کرنے کی صورتیں تجویز کریں۔ حوادث اور نوازل کو کتاب وسنت کی کسوٹی پر پرکھیں عصری تقاضوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالیں، نہ یہ کہ خود اسلام کو کھینچ تان کر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔ مگر مغربی جمہوریت ایسا نہیں کرتی بلکہ تمام ارکانِ اسمبلی کو بے لگام چھوڑ کر ووٹنگ کے نام پر خدا اور رسول کی تشریعی حیثیت کو چیلنج کرتی ہے جبکہ قانون سازی کی حد تک اسلام میں قطعی ڈکٹیٹر شپ ہے جو اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ مخصوص ہے۔ عوام اور رعایا کو اس میں دخل اندازی کا حق نہیں۔

★

اسلام میں اگر جمہوریت ہے تو وہ صرف اس معنی میں کہ مسلمانوں کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ قوتِ حاکمہ بھی خدا اور رسول کے تشریعی اختیارات میں دست اندازی نہیں کر سکتا۔ وہ ہر شہری کو حق دیتا ہے کہ منکرات پر قرآن وسنت کی روشنی میں تنقید اور معروفات کی تلقین کرے۔ کلمہ حق کہنے کا حق ہر جابر و قاہر بادشاہ کے سامنے ہر ادنیٰ رعیت کو حاصل ہے۔ بھلائی کی بات سے کوئی طاقت کسی مسلمان کو نہیں روک سکتی۔ یہ آزادی رائے اسلام کی خاطر ہے۔ اسلام کے خلاف نہیں۔

ایک ضعیف بڑھیا فاروق اعظمؓ جیسے خلیفۂ عادل کو ٹوکنے کی مجاز ہے۔ صدر مملکت ہر بات میں اللہ اس کے رسول اور تمام رعایا کے سامنے جوابدہ ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جمہوریت کے نام پر ہر فرد دین شریعت، اخلاق اور تہذیب کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کے اس غلط مغربی تصوّر کی وجہ سے بعض خود غرض امراء اور بے دین اصحابِ قلم نے یہاں تک کہا کہ اسمبلی کا دائرہ اختیار اس حد تک وسیع ہے کہ اُسے "مرکز ملّت" کی حیثیت حاصل ہے، اور رسولؐ کی اطاعت کی طرح اس کے ہر فیصلے کی اطاعت لازمی ہے۔ یہ تصوّر منکرین حدیث کے قائد پرویز اور ایک حد تک فضل الرحمان نے عام کیا۔ صدر ایوب نے جو اپنے آمر مطلق ہونے کے لئے شرعی سند بھی ڈھونڈھنا چاہتا تھا۔ نہ صرف اس کافرانہ نظریہ کی حوصلہ افزائی کی بلکہ اپنی خود نوشت سوانح میں اس تصوّر کو بھی عام کرنا چاہا کہ پارلیمنٹ کی آئین سازی کو شریعت کے ایک اہم اور بنیادی اصول "اجماع" کی حیثیت حاصل ہے جس کے بعد اس کے فیصلوں پر عمل ساری امت کے لئے لازمی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ محض جہالت یا فریب کاری کا ایک کرشمہ ہے اور تمام فقہاء امت نے اجماع کی جو تعریف کی ہے اور جو اصول اور شرائط اس کے انعقاد کے لئے طے کئے ہیں اسکی ادنیٰ مناسبت بھی پارلیمنٹ کے فیصلوں سے نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ جو اجماع تمام مسلمانوں کے ممتاز ترین اہل علم اور علماء راسخین کا (جو اجتہاد کی اہلیّت رکھتے ہوں۔) کتاب وسنت اور قیاس صحیح کی روشنی میں کسی حکم پر متفق ہونے کا نام ہو وہ دنیا کے کسی خاص خطہ کے چند ایسے افراد کے فیصلہ پر کب صادق ہو سکتا ہے، جن میں فقہاء اور مجتہدین تو کیا نام کے علماء بھی صرف دو ایک ہوں۔ باقی اکثریت صرف عام مسلمانوں کی نہیں بلکہ غیر مسلم اقلیتی افراد اور خود مسلمانوں میں دین کے بارہ میں معاندانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کی ہو، اور عورتیں بھی اس میں شامل ہوں اور اس کے فیصلے کتاب وسنّت کی کسی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کی نفی کرنے والے ہوں۔ اپنے دین کے اصول کو اس طرح بازیچۂ اطفال بنانے کی مثالیں غیر مسلم اقوام میں بھی کم ہی ملیں گی۔

★

ہمارے سامنے فقہاء امت کی قانونی اور آئینی تفصیلات اور تشریحات کا ذخیرہ موجود ہے، انہوں نے ہر دور کے نازک اور پیچیدہ ترین مسائل پر اصولِ شریعت کی تطبیق و تنقیح کا ایک بے مثال کارنامہ چھوڑا ہے، مگر اس کی حیثیت بھی از خود کسی قانون سازی کی نہیں بلکہ

ول و عمل کی روشنی میں کسی چیز کی جائز یا ناجائز حیثیت ظاہر کر دینے کی ہے، اسلامی فقہ
کے تمام مکاتب نے اگر کسی رائے کو کتاب و سنت سے زیادہ قریب پایا تو اسے قبول کر
یا اور جسے ہٹا ہوا سمجھا اُسے مسترد کر دیا، خواہ اس کے کہنے والے کتنے زیادہ کیوں نہ
ہوتے جب تک کوئی فیصلہ کتاب و سنت اور اس کے منشاء و علت پر مبنی نہ ہوتا، ناقابل
ول ہوتا۔ امام ابو حنیفہؒ کی کوفہ والی مجلس قانون میں فیصلہ کتاب و سنت پر ہوتا، کبھی کسی مسئلہ میں
رف ووٹنگ اور اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا گیا۔

★

بہرحال یہ تو ایک تمہیدی بات تھی جو طول پکڑ گئی، آج کی فرصت میں ان خطرات اور مشکلات کی ایک جھلک دکھانا مقصود ہے جو صدر محترم محمد یحییٰ خان کے آئینی ڈھانچہ کے سلسلہ میں قرآن و سنت اور اسلامی نظریہ کی رعایت پر زور دینے کے باوجود بھی ہمارے سامنے ہیں اور جو آئندہ تشکیل پانے والی اسمبلی کی صورت میں بھی اسلامی آئین سازی کے لئے سدّ راہ بن سکتے ہیں۔ اس اسلامی قانون سازی کی حیثیت کیا ہوگی۔؟ اور اس کے لئے دینی اور علمی اہلیت کا معیار کیا ہوگا۔؟ وہ کیا صورتیں ہیں جو ارکان اسمبلی کو کتاب و سنت کے دائرہ میں پابند بنا سکتی ہیں۔؟ اور وہ کونسا با اختیار ادارہ ہوگا جو کسی معاملہ میں نزاع کی صورت میں اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرے گا۔؟ پھر اسکی کیا ضمانت ہے کہ وہ ادارہ پچھلے دور کے شراب اور ربوا کو حلال کرنے والی "عبقری شخصیتوں" سے پاک رکھا جائے گا۔؟ اور وہ کونسی طاقت ہوگی جو تمام ارکان کو اسلام کی اپنی من مانی تشریح اور ترجمانی سے روک کر انہیں اسلام کے مسلّمہ قطعی اور متوارث مفہوم کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے گی۔؟ یہ چند سوالات ہیں جو ملک کے تمام اہل علم اور اصحاب فکر کی توجہ کے مستحق ہیں اور اس کے قابل اطمینان جواب پر ہی ملک کو ایک ایسا مکمل اسلامی آئین مہیا ہو سکتا ہے۔ جو اسلام اور عوام کی ضروریات کے تمام تقاضوں کا آئینہ دار ہو۔

★

اس سلسلہ میں صدر یحییٰ کے انتخابی ڈھانچہ سے ایک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے کہ انہوں نے آئین کے چند بنیادی اصول میں نہ صرف قرآن کریم بلکہ سنت رسول کو بھی ملحوظ رکھنے کو لازمی قرار دیا ہے اور اگر کوئی آئین اس اصول کے تقاضوں پر پورا نہ اترے تو اُسے مسترد کر، (رھ

وعدہ کیا ہے مگر سیاستدانوں کا اسمبلی میں جاکر ایسے کسی آئین پر متفق ہونا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ اور اگر یہی بات ہوئی تو بظاہر ایک تو عامۃ المسلمین ایسے کسی دستور کو تسلیم نہیں کرسکیں گے۔ اور پھر صدر صاحب بھی اپنے وعدہ کے مطابق اسے مسترد کرکے دوبارہ انتخابات کرائیں گے مگر اسکی کیا ضمانت کہ دوبارہ تشکیل پانے والی اسمبلی بھی وہی سبق نہیں دہرائے گی۔ نتیجۃً ملک نامعلوم عرصہ تک غیر آئینی تعطل کا شکار ہوکر ملک و ملت کے فکری اور ملی انتشار میں اضافہ در اضافہ کرتا چلا جائے گا۔

ان حالات میں اپنی حقیر دانست میں اس مشکل کا فوری حل ہے۔ اگر ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آئین کا مسئلہ اسمبلی پر چھوڑ دینے کی بجائے حکومت اسے اپنے غیر معمولی اختیارات کے ذریعہ حل کرادے اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ پورے اسلامی آئین (جسے اگر وہ چاہے تو ملک کے ممتاز اصحاب علم و فکر قابل اور متدین اور معتمد اہل افراد کے ذریعہ جلد ہی مرتب کروا سکتی ہے۔) یا فی الحال کم از کم اسلامی نظام کے تمام بنیادی اصول و ضوابط کو آئین میں شامل کرا دینے کا حکم نافذ کردیا جائے اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو دستور کے ان ۲۲ نکات کو ابھی سے آئین میں شامل کرا دینے کا حکم نافذ کرادیا جائے جس پر ملک کے تمام مکاتب فکر کے جید اور مستند علماء نے اتفاق کیا تھا۔ اور نہ اب تک کسی سیاسی پارٹی نے براہ راست اسکی مخالفت میں آواز اٹھائی ہے اسوقت بظاہر اکثر سیاسی پارٹیاں (گو ان کے باطنی عزائم اور نظریات کچھ بھی ہوں)، دعووں کی حد تک اسلامی ضابطہ حیات اور اس کے عادلانہ نظام کی اہمیت اور ضرورت پر متفق نظر آتی ہیں۔ بھاشانی تو ماشاء اللہ خلافت راشدہ کا دور لوٹانا چاہتے ہیں، بھٹو کا اعلان ہے کہ ہم کسی بھی غیر اسلامی نظام کو نافذ نہیں ہونے دیں گے۔ مجیب الرحمان تو قرآن کے ساتھ سنت کا بھی نام لے رہے ہیں۔ خان عبدالقیوم خان ہاتھ میں قرآن اٹھائے پھر رہے ہیں۔ سرحد نیشنل پارٹی بھی تقریروں میں اسلام کا ذکر کرتی رہتی ہے۔ پی ڈی پی اور مسلم لیگیوں کا ماضی جیسا بھی ہو اب تو انہیں اسلام کی حفاظت کی شدید فکر ہے۔ اور ماشاء اللہ جماعت اسلامی۔؟ وہ تو پورے اسلام کو بلاشرکت غیرے اپنے لئے الاٹ کرواچکی ہے۔ رہے علماء کرام تو ان کا تو فرض منصبی یہ ہے کہ اسلام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔ ایسی سازگار صورتحال میں (جو انتخابات کے بعد یکسر بدل جاتی ہے) اگر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بحیثیت ایک بااختیار مسلمان اور ذمہ دار شخص کے آگے بڑھ کر از خود اسلامی آئین کا مسئلہ حل کرواتے ہیں تو ایسے اقدام کو ہرگز غیر جمہوری نہیں کہا جاسکے گا اور اسطرح ان تمام سیاستدانوں کے نعروں اور عمل کا بھی امتحان ہوجائے گا کہ ان کے اسلامی نعرے اور منشور محض انتخابی فراڈ ہیں یا عمل اور عقیدے سے بھی اس کا کوئی جوڑ ہے۔ اس سے

یہی گورنمنٹ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ، قبائلی علاقوں کے الحاق، آبادی کے تناسب سے ایوان میں نمائندگی اور ون یونٹ توڑنے میں اپنے غیر محدود اختیارات سے کام لے کر اپنی دور اندیشی کی ایک مثال قائم کر چکی ہے۔ ان اقدامات سے ملک کے ہر فرد کو اتفاق نہ ہونے کے باوجود بھی ملک کے مفاد کی خاطر ان اقدامات کو غیر جمہوری نہیں بلکہ مسائل کا واقعاتی مطالعہ، بصیرت اور تدبر سمجھا گیا ہے۔ پھر جبکہ اس وقت ملک کو درپیش اہم اور اصل مسئلہ آئین کا ہے۔ اور اس کے حل نہ ہونے کی صورت میں ملک کی نیا ڈوبتی نظر آرہی ہے۔ "جمہوریت" کے نام پر اسے مزید غیر یقینی حالات اور متضاد نظریات رکھنے والے غیر مخلص ارکان کے سپرد کر دینا کہاں کی دانشمندی ہو سکتی ہے۔ جبکہ اسلامی آئین یا اسکی بائیس بنیادی دفعات پر دیگر انتظامی اور انتخابی مسائل کی بہ نسبت مسلمانوں کی اکثریت متفق ہے حکومت کا ایسا کرنا ڈکٹیٹر شپ نہیں ہوگا، بلکہ جلد از جلد ملک کے باشندوں کو ان کے تمام حقوق دیکر انہیں اس ملک کی صحیح حکمرانی میں شریک کرانے کے مترادف ہوگا۔

★

اسلامی آئین کی بات سن کر کچھ لوگ ایسے موقع پر مختلف فرقوں کی بنیاد پر اسلام کا ایک ناقابل عمل آئین ہونے کا افسانہ کھڑا کر دیتے ہیں، اور یہ ان کی سراسر فریب کاری ہوتی ہے۔ دراصل ایسے لوگ باطنی منافقت اور دلوں کے کھوٹ کی وجہ سے اسلام کو بحیثیت دستور العمل کے ایک دین ہی نہیں سمجھتے اور اسی مغالطہ انگیزی سے کام لے کر اللہ اور رسول کی لائی ہوئی شریعت کو اس ملک میں نافذ ہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ ظاہر بات ہے کہ آئین اور دستور کا زیادہ تر تعلق رعایا کی باہمی معاشرت، تمدن اور داخلی و خارجی معاملات سے ہوتا ہے عبادات سے نہیں اور جہاں تک خرید و فروخت، اجارہ، زراعت یا اس قسم کے تمام معاملات کے احکام کا تعلق ہے۔ اس ملک کے تمام اسلامی فرقوں کا اس میں اختلاف نہیں، معاشرتی قوانین نکاح، طلاق عدت، باہمی حقوق، میراث وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ سود، زنا، شراب، جوا، سمگلنگ، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، ڈکیتی، اغواء الغرض مال و جان میں دست اندازی کی تمام شکلیں سب کے ہاں ناجائز اور قابل سزا جرائم ہیں سُنی تو کیا کسی شیعہ کو بھی ان امور کی قباحت میں تامل نہ ہوگا۔ اخلاق اور معاشرہ کی استواری کے تمام احکام اور ہدایات سے بھی کسی کو اختلاف نہیں، ملک کے انتظامی امور اور ترقیاتی منصوبوں کے بارہ میں بھی اسلام کا کوئی مکتب فکر دوسرے سے دست و گریباں نہیں۔

حدود اور تعزیرات میں سب متفق الخیال ہیں۔ بے حیائی، فحاشی کی تمام صورتیں ہر مکتبِ فکر میں ناقابل برداشت ہیں، کوئی بھی فرقہ اس معاشی ناہمواری یا غیر فطری مساوات کا قائل نہیں، جو مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسلام کا ہر فرقہ یہی کہتا ہے کہ اسلام کسی خاص طبقہ کی معاشی خوشحالی کا محافظ نہیں بلکہ وہ غریب وامیر سب کے حقوق اور سب کی بنیادی ضروریات کا کفیل ہے پس وہ کونسی رکاوٹ ہے جو باہمی اختلافات کی وجہ سے اسلامی آئین کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے، مختلف مکاتیبِ فکر کے اختلافات کا زیادہ تر ظہور عقائد اور عبادات میں ہوتا ہے، جس کے مٹانے اور کسی ایک فقہی اور فروعی نقطۂ نظر پر متفق کرانے کا حق شریعت نے خاص مصلحتوں کی وجہ سے کسی اسلامی اقتدار کو دیا ہی نہیں بلکہ اسے آئین کے دائرہ سے باہر چھوڑا گیا ہے۔ نماز میں قرأت یا آمین کہنا جہر ہے یا خفیہ، رفع یدین ہے یا نہیں۔؟ وتر کی رکعات کتنی ہیں۔؟ حج میں قران افضل ہے یا تمتع، سفر میں دو رکعت بہتر ہیں یا چار۔؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا بشر؟ عالم الغیب اور حاضر وناظر ہیں یا نہیں۔؟ حضرت علیؓ افضل تھے یا ابوبکرؓ وعمرؓ، ائمہ کی تقلید ضروری ہے یا نہیں۔؟ اور اس قسم کے دیگر مسائل گو ان میں سے بعض عقائد کی حد تک بے حد نزاکت اور اہمیت کے حامل کیوں نہ ہوں۔؟ مگر ان اختلافات سے ملک کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور تمدنی مسائل میں کتاب وسنت کی بالادستی ہرگز ہرگز متاثر نہیں ہوسکتی۔ ہاں اگر کچھ لوگ اسلام کے صریح محرمات، شراب، جوا، زنا، سود وغیرہ کو حلال ٹھہرانے لگیں حدود اور تعزیرات کو ظلم اور وحشت سمجھنے لگیں، اخلاقی آوارگی، بے حیائی اور فحاشی کو ترقی اور کامیابی قرار دینے لگیں تو ایسے لوگوں کی مخالفت کا اعتبار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ایسے لوگ اسلام یا اسکے کسی فرقے میں داخل کب رہ جاتے ہیں ان کا مطلب تو یہ ہے کہ کل ہم اس ملک کے عیسائی، یہودی، ہندو اور قادیانی اقلیتوں کی موجودگی کو سرے سے اسلامی آئین ہی کے لئے وجہ جواز بنا دیں۔ ایسا کرنا یقیناً اس ملک کے بنیادی مقاصد سے غداری کرنا ہوگا۔

بہرحال اگر ہم تمام انتخابی اور سیاسی امور میں اختلافات کے باوجود کوئی دو ٹوک قدم اٹھانا حکومت کے لئے غیر جمہوری نہیں تو اسلام جیسے متفقہ مسئلہ میں حکومت کا ایسا کوئی مومنانہ قدم اٹھانا نہ صرف اکثریت کے جذبات کی رعایت ہوگی، بلکہ ملک کو گرداب سے نکالنے اور تاریخ میں ایک لامثال مقام حاصل کرنے کی صورت ہوگی۔

~★~

نئی تعلیمی پالیسی کے ضمن میں حکومت نے بعض ذیلی کمیٹیاں بنائی ہیں، سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اسلامیات کیلئے بھی ایسی ہی ایک نصاب کمیٹی کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہم سردست حکومت کے ایسے اقدامات کو نہایت تحسین سے دیکھتے ہوئے بھی اتنا عرض کریں گے کہ ایسے نصاب پر ملک کے تمام مسلمان بچوں کے دینی مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہاں کی اکثریت اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی ہے اور اپنے جذبات اور دینی احساسات سے گرویدگی بھی بہرحال ظاہر ہی ہے، حکومت کی نامزد کمیٹی کے بارہ میں ہمیں جو معلومات پہنچی ہیں فی الحال اس کی تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ہم اتنا عرض کریں گے کہ اگر ایسی اطلاعات صحیح ہیں تو ملک کی سواد اعظم ایک لمحہ کیلئے بھی ایسے کسی نصاب کو قبول نہیں کر سکے گی، جس میں ان کی دینی ضروریات اور محبوب معتقدات سے ذرہ برابر بھی بے انصافی برتی گئی ہو۔ امید ہے کہ تعلیم سے وابستہ ذمہ دار افراد اس بارہ میں دیانتداری، خلوص اور سیاسی سوجھ بوجھ کا ثبوت دے کر ملک میں کسی نئے فتنے کے ابھارنے کا ذریعہ نہ بنیں گے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔
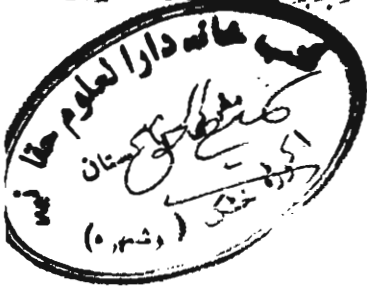
حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ نے اسلامی نصاب کیلئے مرکزی حکومت کی تشکیل کردہ کمیٹی کے سلسلہ میں مرکزی وزیر تعلیم کو حسب ذیل ٹیلیگرام دیا ہے اور ملک کے تمام سنجیدہ افراد سے اس مسئلہ میں آئینی قدم اٹھانے کی اپیل کی ہے:

"تعلیمی پالیسی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے عرض ہے کہ نئی تعلیم کے اداروں میں اسلامیات کے نصاب کیلئے مجوزہ کمیٹی میں ملک کی اکثریت (MAJORITY) کے جذبات اور معتقدات کا لحاظ رکھتے ہوئے اہل سنت کے ماہر علماء اور مدارس عربیہ سے تعلق رکھنے والے مستند حضرات کو لیا جائے ورنہ تمام مسلمانوں کیلئے ایسا کوئی نصاب قابل قبول نہ ہوگا جس میں دینی تقاضوں کی پوری رعایت نہ برتی گئی ہو۔"

مولانا سید عبدالقدوس ندوی ہاشمی اسلام آباد

مستشرقین اور اسلامی تحقیقات

وہ کیا چاہتے ہیں ___ ؟

ادوار ___ اور ___ مقاصد

مقالہ نگار صاحب علم وفضل بزرگ ہیں انہوں نے اس اہم موضوع پر اپنا یہ مقالہ ۳۰ ستمبر کو راولپنڈی کے اجتماع شام ہمدرد میں پڑھا تھا، جس میں اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی کہ مستشرقین کی اسلامی تحقیقات سے دلچسپی اور شغف رکھنے کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ استعمار کے لئے راستہ کی ہمواری، مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنا، قرآن وسنت اور اسلام کے مبادیات میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو اپنے علمی ودینی سرچشموں سے برگشتہ کرنا ہے۔

(ادارہ)

یہودیوں اور عیسائیوں کا واسطہ مسلمانوں سے بالکل ابتدائی دور میں ہوگیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مکی دور ہی میں یہودی اور عیسائی دین اسلام پر اعتراضات کی ابتداء کر چکے تھے اور مخالفت کرنے میں وہ قریش کے بت پرستوں کے ہمنوا تھے۔ مدینہ منورہ کے دس سالہ دور میں یہ مخالفت اور زیادہ شدت اختیار کرگئی۔ خصوصاً یہودیوں کی مخالفت اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ قرآن حکیم کے وحی الٰہی ہونے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی صادق ہونے کے خلاف طرح طرح کے اعتراضات ان کی طرف سے ہوتے رہے۔ قرآن مجید کی مکی اور مدنی آیتوں میں ان کے بعض اعتراضات اور جوابات کا ذکر موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت صدیقی وفاروقی میں ان لوگوں سے مسلمانوں کو ہر جگہ واسطہ پڑا۔ اور عراق وشام کی فتوحات نے تو آپس میں ایک دوسرے سے ملنے کی راہیں پوری طرح کھول دیں۔ عیسائی علمائے مذہب نے اس زمانہ سے بطور مہم کے اسلام اور اس کی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنے اور قرآن مجید اور سیرت رسول کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کرنے کی ابتداء کر دی تھی۔ مگر اس زمانہ میں ان کی

طرف خود عیسائی بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بازنطینی حکومت کی سخت گیری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی رواداری اور آزادی نے مفتوحہ علاقوں کی غیر مسلم آبادی کے لئے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ لوگ مسلمان فاتحین کی آمد کو "خدا کی رحمت" سے تعبیر کرتے تھے اور اپنے متعصب مذہبی پیشواؤں کی طرف لوگ کم ہی توجہ کرتے تھے۔ اس زمانہ میں لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ مصر و شام کے عیسائی اور یہودی علماء اور پیشوایانِ مذاہب اس کے مقابلہ میں بے دست و پا سے ہو گئے تھے۔

ولید بن عبد الملک (۸۶ - ۹۶) کے دور میں کاشغر، بخارا اور سندھ فتح ہو گیا، اور اس زمانہ میں اندلس بھی ممالکِ اسلامیہ میں شامل ہوا۔ اب اہلِ یورپ سے مسلمانوں کا براہ راست تعلق قائم ہو گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی یورپ کے زائرین بڑی تعداد میں بیت المقدس میں کنسیۂ قیامت اور ولادت گاہِ مسیح کی زیارت کیلئے جاتے تھے بلکہ بہت سے یورپین طلباء بیت المقدس اور دمشق میں رہ کر علم حاصل کرتے تھے مگر ان کا تعلق اتنا گہرا اور ایسا دوامی نہ ہوتا تھا جیسا کہ اندلس کی فتح کے بعد سے ہو گیا۔

تفصیلات کے بیان کا یہ موقع نہیں، غرض یہ ہے کہ یورپ کے طالبانِ علم کا تعلق اور عیسائی و یہودی پیشوایانِ مذہب کی اسلام کے خلاف، علم فلسفہ اور تحقیقات کے نام سے، مساعی بالکل ابتدائی دور اسلامی ہی سے جاری تھیں۔ اور آج تک جاری ہیں۔ اس لئے ہم تاریخ کے کسی خاص وقت کو اس جد و جہد کا نقطۂ آغاز قرار نہیں دے سکتے۔ البتہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کے طریقے بدلتے رہے۔ مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن کلیسا کا زور ٹوٹنے کے بعد سے کچھ ایسے مستشرقین ضرور پیدا ہوئے جنہوں نے جرأت کے ساتھ اپنے ہی اساتذہ کی پھیلائی ہوئی بہت سی باتوں کو غلط قرار دیا اور پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس تردید سے ان کا مقصد سچ کو سچ کر کے دکھانا تھا یا خود اپنی طرف سے پیدا کئے ہوئے شکوک کو قابل قبول قرار دینا تھا۔ اس لئے کہ ان تردید کرنے والوں میں سے اکثر نے جہاں اپنے پیش رو مستشرقین کے کذب و افترا کی پوری قوت کے ساتھ تردید فرمائی ہے وہاں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دئیے ہیں۔ اور اتنی معصومیت کیساتھ دبی زبان میں کوئی نہ کوئی نئی بات کہہ گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کی نیت پر کوئی شبہ بھی پیدا نہ ہو سکے۔

مثلاً لندن یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر علامہ ڈینس سورا اپنی کتاب "تاریخ الادیان" میں قرآن مجید

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے سروپا اعتراضات اور اپنے ماقبل کے مستشرقین کی پھیلائی ہوئی جھوٹی باتوں کی پوری قوت کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں لندن سے شائع ہوئی ہے، وہ اپنے بیان میں اس قدر غیر متعصب اور بے لاگ مصنف نظر آتے ہیں کہ کسی کو ان کی نیت پر شبہ کرنے کی گنجائش نظر نہیں آتی بلکہ وہ اچھے خاصے عقیدتمند کی طرح بیان کرتے ہیں کہ:

"مذاہب کے عظیم بانیوں میں سے شاید محمدؐ ایک ہی شخص ہیں جن کی شخصیت تاریخی حیثیت سے بالکل واضح ہے اور خرافات نے ان کی شخصیت پر کوئی پردۂ خفا نہیں ڈالا ہے۔"

اور اس کے بعد عقیدتمندانہ انداز میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کی تعریف کرتے ہیں بلکہ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ بھی کہتے کہ:

"بلاشبہ عرب کے لوگ جنوں اور روحوں کی پوجا کرتے تھے اور روحوں کے حجری مجسموں میں جاگزیں ہونے کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ قبیلہ قبیلہ کے الگ الگ بت بھی ہوتے تھے۔ اسلام نے ان سب بتوں کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف ایک حجر اسود کو باقی رکھا۔ شاید اس لئے کہ اس سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا احترام مقصود تھا یا شاید یہ ایک سیاسی عمل تھا جس کے ذریعہ عربوں کے باہمی اتفاق کو باقی رکھنا مقصود رہا ہو۔ (ص ۲۲ المستشرقون والاسلام مصنفہ زکریا ہاشم زکریا۔ مطبع القاہرہ ۱۹۶۵ء)

آپ نے دیکھا کہ فاضل پروفیسر نے کس معصومیت کے ساتھ یہ یقین دلانے کی سعی فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی مصلحت کی بناء پر ایک "بت" کو باقی رکھا اور اس حد تک بت پرستی کو اسلام میں جائز قرار دیا۔ حالانکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی جب کہ سینکڑوں بت تھے کبھی حجر اسود کو بتوں کے زمرہ میں نہیں شمار کیا گیا اور نہ کبھی اس کی پوجا کی گئی۔ حجر اسود کا ذکر ہی کیا۔ اٹھارہویں صدی تک یورپ کے مستشرق اور محققین یہ لکھتے رہے اور مشہور کرتے رہے کہ مسلمان جو حج کو جاتے ہیں وہ اس لئے جاتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک برنجی بت بنا کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان اس بت کو سجدہ کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں خود علمائے یورپ نے اس کی تردید کی اور ایک بار نہیں بار بار مختلف ممالک کے علماء نے اسکی تردید کی۔ تب یہ خیال لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکا۔ یا شاید

اب بھی دور افتادہ دیہاتیوں میں یہ خیال موجود ہو۔

بہرحال جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی گئی، عربی کی کتابیں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر شائع ہوتی رہیں۔ اور یہ انتہائی حق ناشناسی ہوگی کہ عربی کتب کے اصل مضمون کی تصحیح واشاعت اور ان میں سے بہت سی کتابوں کے یورپین زبانوں میں ترجمہ کرنے کی جو عظیم الشان خدمت پچھلے پانچ سو سال کے اندر یورپ کے مستشرقین نے انجام دی ہے۔ اس سے انکار کیا جائے یا ان کو کمتر درجہ کا کارنامہ قرار دیا جائے۔ اس کے لئے سینکڑوں مستشرقین نے اپنی عمریں صرف کیں۔ حکومتوں اور بادشاہوں نے لاکھوں روپے خرچ کئے۔ دولت مندوں نے بڑے بڑے اوقاف قائم کئے اور آج عربی کی بڑی بڑی اہم کتابیں جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ ان میں سے بہت سی کتابیں وہی ہیں جو ان ہی مستشرقین کی مساعی جمیلہ سے پہلی بار طبع ہوکر ہمارے ہاتھوں میں آسکی ہیں۔ اس طرح افترا پردازی کا وہ بادل بھی آہستہ آہستہ چھٹ رہا ہے جو صدیوں تک قدیم مستشرقین اور پیشوایان مذاہب کے بیانات اور ان کی تحریروں سے یورپین ذہنوں پر چھایا ہوا تھا۔ اب تحریروں کے انداز اور مستشرقین کے تحقیقات اسلامی کا طریقہ کسی نہ کسی قدر بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ اب بھی مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ اب بھی مقاصد میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دکھائی دیتی ہے۔ پادری زدیر کی "تحقیقات اسلامی" اور ڈاکٹر کینٹویل اسمتھ کی "تحقیقات" میں مقاصد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ملتا۔ دونوں کی تحقیقات کو دیکھ لیجیے۔ مقصد وہی استعماریت کی تائید اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی سعی ہے۔

چار ادوار مستشرقین یورپ کی اسلامی تحقیقات کو ہم سہولت مطالعہ کے لئے چار ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ پہلا دور ابتدائے تاریخ اسلامی یعنی ساتویں صدی مسیحی یا گریگوری سے لے کر پندرہویں صدی مسیحی یعنی بیداری یورپ تک۔

۲۔ دوسرا دور پندرہویں صدی کی ابتدا سے اٹھارہویں صدی کے اختتام تک۔

۳۔ تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتدا سے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے ختم یعنی ۱۹۲۵ء تک۔

۴۔ چوتھا دور ۱۹۲۶ء سے آج تک۔

دور اوّل میں یورپ کی حیثیت شاگردوں کی سی ہے اور مسلمانوں کی حیثیت استادوں کی سی۔ یہ دور تقریباً آٹھ سو سال کے طویل زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس دور میں مسلمان اندلس میں صقلیہ میں اور

جنوبی ایطالیہ میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے، ان کے بڑے بڑے علماء اور فلسفی ان علاقوں میں موجود تھے۔ اس وقت علم اور تمدن کے مالک مسلمان تھے۔ ان ہی کی تہذیب، تہذیب تھی اور ان ہی کے علوم، علوم شمار کئے جاتے تھے۔

اس دور میں عیسائیوں اور خصوصاً یورپ کی ساری علمی زندگی پر ارباب کلیسا کا قبضہ تھا۔ پاپائے اعظم اور ان کے نائبین مسلمانوں سے مختلف علوم حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے اور عربی کتب ورسائل جمع کرتے تھے اسلامی قوانین کا تھوڑا بہت مطالعہ اس دور کے آخری حصہ میں کیا گیا۔ طب، فلسفہ، فلکیات، زراعت، اور قانون پر مسلمانوں کی تصانیف کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ زبانوں میں ہوا۔ ابن رشد اور جابر بن اسحاق اور ابن سینا کی کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔ یہ کام عموماً ایطالیہ میں اور کسی قدر فرانس میں ہوا۔ لیکن نیابت دانائی کے ساتھ فارابی کو "فاربس" ابن رشد کو "ایوی روس" جابر کو "جیبر" اور ابن سینا کو "اوی سینا" بنا دیا گیا۔ اور طلباء کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ یہ لوگ یورپین عیسائی نہیں بلکہ مسلمان تھے۔ اگرچہ یہ راز زمانہ مابعد میں راز نہ رہ سکا۔ لیکن یورپ کے کچھ نہ کچھ لوگ اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یورپین تھے اور مذہباً مسیحی تھے۔

اس دور میں مسلمانوں اور دین اسلامی سے متعلق بڑے عجیب عجیب ہیبتناک قصے ارباب کلیسا کی طرف سے پھیلائے گئے۔ کچھ مسلمانوں کی سفاکی کے قصے اور کچھ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بے سروپا افسانے خوب خوب گھڑے گئے اور اسی زمانہ میں یورپ والوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مسلمان مکہ میں رسول اللہ کے برنجی بت کو سجدہ کرنے کیلئے جایا کرتے ہیں۔

اس زمانہ کے اجلائے مستشرقین میں سب سے اول نام "جربردی اورلیاک" ایک فرانسیسی راہب کا ملتا ہے۔ یہ فرانس میں ۹۳۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۰۰۳ء میں بمقام ویٹکین وفات پائی۔ اس نے اندلس کے مدارس میں برسوں رہ کر تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت کی وجہ سے واپس آکر فرانس و ایطالیہ میں بڑا نام پیدا کیا۔ واپسی پر وہ ایطالیہ میں مستقل اقامت گزیں رہا۔ حتیٰ کہ ۹۹۹ء میں وہ پاپائے اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر منتخب ہو گیا۔ اس نے دو عربی مدرسے قائم کئے اور فلکیات و ریاضیات کی بعض کتابوں کے عربی سے ترجمے بھی کئے۔ اس کے تراجم و تصانیف کا مجموعہ ۱۸۹۹ء میں برلن سے شائع ہوا ہے۔ (نجیب العقیقی۔ المستشرقون۔ ج۔۱ ص ۱۲۰ طبع مصر ۱۹۶۴ء)

اس دور کے مستشرقین "اورلیاک" کے علاوہ قسطنطین الافریقی المتوفی ۱۰۸۰ء ادجودی سانتا۔ ڈی کویل۔ ایڈیلارڈ۔ پیطرس۔ یوحنا۔ رابرٹ۔ ہرمان۔ ڈینل مورلے۔ میکل اسکاٹ۔ لیونارڈ۔ تھامس

ڈی اگوین، روجر بیکن اور ریمنڈ لیو وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ یہ سب اندلس صقلیہ اور دیگر اسلامی ممالک کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ اور بہت سی عربی کتابوں کے فرنچ اور لاطینی میں ترجمے کئے ہیں۔ تقریباً یہ سب راہب یا کلیسا کے خدام ہیں۔

اسی دور کا ایک بڑا فاضل اے تورمیدا بھی ہے جس نے ایطالیہ میں تعلیم حاصل کی۔ بہت دنوں تک عیسائی خانقاہ کا مرشد اعلیٰ رہا۔ اس کے بعد تونس چلا گیا۔ وہاں صدق دل سے مسلمان ہو گیا۔ اور عبداللہ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہیں تقریباً اسی سال کی عمر میں ۸۳۲ھ ۱۴۳۲ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر تونس میں باب المنارہ میں ہے۔ (حوالہ سابق ص ۱۳۲)

شیخ عبداللہ تورمیدا کے علاوہ اور بہت سے اطالوی اور فرنچ مستشرقین نے مطالعہ کے ذریعہ دین حق کو پا لیا اور مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے اسلام پر لاطینی اور فرنچ میں کچھ رسالے بھی لکھے تھے۔ خدا جانے کہ یہ رسالے اب کہیں موجود ہیں یا ضائع کر دئے گئے۔

۲۔ دوسرا دور جو یورپ کی بیداری پندرھویں صدی مسیحی سے اٹھارہویں صدی کے ختم تک تقریباً (۳۰۰) سال پر مشتمل ہے دولت عثمانیہ ترکیہ کی اقبال مندی کا زمانہ ہے۔ ۸۵۷ھ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور بہت سے ممالک یورپ عثمانیوں کے زیر نگین آ گئے۔ دوسری طرف یورپ میں عام بیداری پیدا ہوئی۔ کلیسا کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر طرح کی سیاسی تعلیمی اور سماجی اصلاحات شروع ہوئیں۔ اور ان کا لب ولہجہ بھی اسلام کے خلاف بہت ہی تلخ ہو جاتا ہے۔ یہ تلخی عثمانی فتوحات کے خلاف جذبات نفرت کی پیداوار ہے۔

اس دور میں ان کے کارنامے یہ ہیں کہ انہوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عربی کتابوں کے قلمی نسخے نکالے اور ان کو طبع کر کے شائع کیا۔ ان کے ترجمے کئے اور اس کے لیے بادشاہوں نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے۔ عالموں نے اپنی عمریں وقف کر دیں۔ ان کارناموں کے علاوہ خود یورپین زبانوں میں اسلام پر اس دور میں بہ کثرت کتابیں لکھی گئیں اور مطبع کی ایجاد نے ان کتابوں کی بہ کثرت اشاعت کو آسان کر دیا۔

اس دور میں یورپین اقوام نے مشرق کی سرزمین ایشیا و افریقہ پر قبضہ جمایا۔ مستعمرات اور یورپین مقبوضات کا یہی زمانہ ہے۔ انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان، سومالیہ اور جنوبی اور مغربی و مشرقی افریقہ پر نیدرلینڈ، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور اطالیہ کے تسلط کی ابتداء اس دور میں ہوئی جن علاقوں پر ان استعمار پسندوں نے قبضہ کیا تھا ان میں سے اکثر میں مسلمانوں کی بڑی بڑی ہی نہیں بلکہ اکثریت کی آبادیاں تھیں۔

وہ کیا چاہتے ہیں۔

قبضہ اور تسلط قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کی زبانیں سیکھی جائیں ان کے عقائد و روایات سے واقفیت حاصل کی جائے۔ ان کو آپس کے اختلافات میں الجھایا جائے۔ ان میں مذہبی تعشف، کو کم کرنے کے لئے ان کے یقین کو شک سے بدل دیا جائے۔ ان کے ایمان و عقیدہ کو وہم اور غیر ثابت شدہ حقیقت قرار دیا جائے۔

ان مقاصد کے لئے یورپین ممالک خصوصاً فرانس و جرمنی نے بڑی جدوجہد کی۔ اس وقت ان کے سامنے اہم ترین مسئلہ ایک یہ بھی تھا کہ دولتِ عثمانیہ کی قوت کو کسی طرح توڑا جائے اس کام کیلئے یہ ضروری تھا کہ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت اور دشمنی پیدا کر دی جائے اور نہ صرف پیدا کر دی جائے بلکہ اس منافرت کو دوامی صورت دے دی جائے۔ اس مقصد کے لئے فرانس کے بادشاہ لوئیس ۱۴ نے بے دریغ دولت صرف کی۔ مستشرقین اور مشرق شناسوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر ان سے عربی قومیت، عربی تمدن، عربی رسم و رواج اور عربوں سے متعلق دوسرے امور پر کتابیں لکھوائی گئیں، عربوں کی تعریف و توصیف کے گیت گائے گئے۔

اس زمانہ کے مستشرقین کا بہت بڑا طبقہ یہ باور کرانے کی دھن میں لگا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام سے پہلے ہی عرب بڑی عزت و شان کے مالک تھے۔ اسلامی تاریخ عربوں کے مجد و شرف کی تاریخ کا محض ایک باب ہے۔ اب تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہوتی تھی۔ عربوں کی الگ تاریخ کوئی نہیں لکھتا تھا۔ لیکن اس دور کی آخری دو صدیوں میں عربوں کو ترکوں کے خلاف تیار کرنے کی منظم جدوجہد یورپین حکومتوں نے مستشرقین کے ذریعہ شروع کی۔ عربی ممالک میں تحقیقاتی وفود کی ابتدا ہوئی۔ آثار قدیمہ نکالے جانے لگے۔ اور عربوں کو وطن قومیت کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ جس کا نتیجہ تقریباً سو سال کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں خاطر خواہ نکلا۔

اس دور کی آخری دو صدیوں میں اسلام کے خلاف کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت کا کام ایطالیہ اور فرانس تک محدود نہ رہا بلکہ ان ہی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے ذریعہ یورپ کے دوسرے ممالک تک پھیل گیا۔ خصوصاً جرمنی اور نیدرلینڈ میں مطابع قائم ہوئے اور لوگ اس سلسلہ میں کام کرنے لگے۔ آخر میں انگلستان میں تعلیمی اور اشاعتی ادارے قائم ہو گئے۔

اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں اولین نام مسٹر جی پوسٹل کا آتا ہے۔ یہ نارمنڈی کے ایک قصبہ بارنٹوں میں ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۸۱ء میں وفات پائی۔ ان کو بادشاہ وقت نے جاگیر بھی دی تھی۔ انہوں نے ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے سفر کئے۔ بہت سی قلمی کتابیں خریدیں اور

عربی و عبری زبان دانی اور مسلمانوں کے عقائد و رسوم پر متعدد کتابیں لکھیں۔ یہ ایک مذہبی پیشوا تھے اور مذہب عیسوی میں بعض باتیں پیدا کرنے کے جرم میں حکومت فرانس نے انہیں قید کر دیا تھا۔ ان کی وفات بھی قید خانہ میں ہوئی۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشاہیر مستشرقین میں بی ویٹیر (۱۶۱۳ — ۱۳۶۷) بی ڈی بر بیلو (۱۶۲۵ — ۱۶۹۵) انطون گالان (۱۶۴۶ - ۱۷۱۵) پادری رینارڈو (۱۶۴۷ سے ۱۷۲۰) اور پادری بارتیلمی (۱۷۱۶ - ۱۷۹۵) وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں اسلام پر کتابیں لکھیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ کلیسا کا طلسم ٹوٹا اور اس دور کے آخر میں کچھ ایسے مستشرقین بھی پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنے پیشرو مستشرقین کی تردید کی۔ اور ساتھ ہی کچھ نہ کچھ نئے شبہات بھی پیدا کر دئے۔

تیسرا دور انیسویں صدی کی ابتداء سے ۱۹۲۵ء تک ہے۔ اس دور میں عربی کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کا کام زیادہ وسعت کیساتھ پیدا ہوا۔ یورپ کی تقریباً ہر بڑی یونیورسٹی میں عربی اور اسلام کے مطالعہ کے لئے خاص شعبے قائم ہوئے۔ عربوں اور ترکوں کے مابین منافرت پیدا کرنے کی مہم بہت تیز کر دی گئی۔ اسلامی کتابوں کے ترجمے بکثرت شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں اسلامی تحقیقات کے نام سے مسلمانوں کے اندرونی اختلاف اور جدید فرق اسلامیہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ عربی قلمی کتابوں کی تشریحی فہرستیں شائع ہوئیں۔ تقریباً ہر ملک میں ایشیائی سوسائٹیاں وجود میں آئیں۔

اس دور کے مستشرقین عربی متون کی تصحیح اور علوم ریاضیہ و تجربیہ کے تراجم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ دو مقاصد کے لئے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ (اوّل) عربوں اور غیر عربوں میں تفریق کے لئے عربوں کی تعریف و توصیف اور غیر عرب مسلمانوں پر الزامات کا التزام اور (دوم) مسلمانوں کی روایات اور ان کی تاریخ کو ناقابل اعتبار قرار دینے کی مساعی۔

اس دور میں قرآن مجید کے متعدد ترجمے ہوئے، قرآن مجید کے الفاظ کی فہرستیں اور لغات القرآن بکثرت تیار کئے گئے۔ مسٹر جی فلوگل (۱۸۰۲ - ۱۸۷۰) اور مسٹر ہملٹن المتوفی ۱۸۲۴ء مترجم ہدایہ اسی دور کے علماء ہیں۔ اس دور کے مشہور مستشرقین میں سے ایڈورڈ ریہاسٹک (۱۸۱۹ - ۱۸۹۱) مسٹر ہیوز مصنف ڈکشنری آف اسلام۔ تھامس کارلائل۔ ولیم میوک مارٹے۔ ایڈورڈ ہنا۔ ابلی اسمنٹ۔ پادری ڈروم۔ سی۔ ای وِلسن گولڈزیہر۔ پادری کموشکو۔ جان جاک سدیلو۔ لیونے کاتیانی۔ پادری فاکاری۔ لازیون۔ بلاشیر اور نالینو وغیرہم ہیں۔

مشہور پروفیسر پامر اور ان کے نامی گرامی شاگرد کرنل لارنس آف عریبیا اسی دور کے بزرگ ہیں چوتھا دور جو ۱۹۲۶ء میں امیر کاتیانی کی وفات سے اب تک ہے۔ اس دور میں تحقیقات اسلامی

کا کام جن مستشرقین نے کیا ان میں نولدیکے اور ان کے شاگرد علامہ بروکلمان اور پروفیسر سخاؤ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح تھامس آرنلڈ، مسٹر جیکس، مونٹ، گمری واٹ۔ پروفیسر گویام۔ لی اسٹورنج۔ مسٹر ہیمب۔ مسٹر انڈرسن۔ پروفیسر مارگولیتھ، ڈینی راس۔ مسٹر اولیری۔ مسٹر لوکارٹ۔ مسٹر براؤن مسٹر ملٹن گب۔ مسٹر لنڈاؤ اور مسٹر لویس وغیرہ ہم نے تحقیقات اسلامی کا کام کیا اور کر رہے ہیں۔ پادری زویمر المتوفی ۱۹۵۲ء بانی رسالہ مسلم ورلڈ بھی اس دور کے ہیں جن کے متعلق خود مستشرقین کی یہ رائے ہے کہ ان کے تعصب نے ان کی تصنیفات کا علمی مرتبہ ہی ختم کر دیا۔

اس دور میں تحقیقات اسلامی کا دائرہ فقہ، اصول فقہ تک وسیع ہو گیا۔ اسلامی فرقوں کے حالات اور ان کے افکار کی طرف توجہ بڑھا دی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ان موضوعات پر کچھ نہ کچھ کام مستشرقین نے کیا ہے مگر اس عہد میں توجہ ان موضوعات اور تصوف اسلامی کی طرف زیادہ ہو گئی ہے۔ اس دور میں ایک بات یہ بھی پیدا ہو گئی کہ بڑی حکومتیں خدا بیزاری اور مذہب سے نفرت کے اصول پر قائم ہوئیں۔ اس کی طرف توجہ ۱۹۲۵ء کے بعد سے ہوئی اور ۱۹۴۵ء کے بعد تو خدا بیزار مملکتوں کا مسلسل پروپیگنڈا خود عیسائیت کے لئے بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے لئے ایک مستقل خطرہ بن گیا۔ اس لئے باستثنائے چند مستشرقین یورپ کا لب و لہجہ اسلام کے خلاف یاوہ گوئی میں نسبتاً نرم ہو گیا اور اس وجہ سے مذاہب کی کانفرنسوں۔ تقریروں اور مقالات صلح و آشتی میں اضافہ ہو گیا ہے اگرچہ اس صورت حال کا اثر سب پر نہیں پڑا۔ پادری سموئل زویمر او ان کے ہمنوا پوری طاقت کے ساتھ اسلام قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لکھتے رہے وہ اپنے لب و لہجہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے۔ مگر پھر بھی دیگر مستشرقین کا ایک بڑا طبقہ اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنی تحریروں کو مصلحتاً کسی قدر نرم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

مقاصد: کسی ذی ہوش آدمی کا ارادی عمل بغیر علت غائی یعنی مقصد عمل کے ممکن نہیں ہے اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ مستشرقین کا عمل تحقیقات اسلامی کسی مقصد کے بغیر ہوتا رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً یہ ساری محنت اور حکومتوں اور اوقاف کی طرف سے اتنے بڑے پیمانہ پر کام، بھی کوئی مقصد رکھتا ہے اور یقیناً ان اعمال کا کوئی مقصد ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مقصد صرف تلاش علم ہو سکتا ہے لیکن یہ خیال اس لئے محض باطل ہو جاتا ہے کہ ہم قدیم زمانہ سے اس کام میں زیادہ تر ان ہی حضرات کو منہمک پاتے ہیں جو عیسائیت کے پرجوش مبلغ ہیں اور آج تک اکثریت ان ہی مبلغین کی، اس کام میں مشغول نظر آتی ہے جو دین

مسیحی کے بہترین مبلغ ہیں۔ ذرا ان چند ناموں پر غور کیجئے یہ سب مسیحی پادری ہیں اور مدتوں تک بطور راہب رہ کر انھوں نے تربیت پائی ہے۔

پادری الیانو	المتوفی ۱۵۸۹ء	پادری ریلیو	المتوفی ۱۸۷۸ء
پادری مارٹن	المتوفی ۱۸۸۰ء	پادری بلن	المتوفی ۱۸۹۱ء
پادری ایوجی	المتوفی ۱۸۹۵ء	پادری کوشش	المتوفی ۱۸۹۵ء
پادری ژی کوپر	المتوفی ۱۹۰۴ء	پادری جولیان	المتوفی ۱۹۱۱ء
پادری بروبر	المتوفی ۱۹۱۹ء	پادری میکارتھی	المولود ۱۹۱۳ء
پادری بولومواسے	المتوفی ۱۹۲۹ء	پادری زیموفلین	المتوفی ۱۹۲۸ء
پادری ڈیورنڈ	المتوفی ۱۹۲۸ء	پادری مالون	المتوفی ۱۹۳۴ء
پادری لامنس	المتوفی ۱۹۳۷ء	پادری کولنگیٹ	المتوفی ۱۹۴۳ء
پادری لاپیرے	المتوفی ۱۹۵۰ء	پادری مونٹوڈے	المولود ۱۸۸۰ء
پادری ہنری چارلس	المولود ۱۹۰۰ء	پادری فلیش	المولود ۱۹۰۴ء

یہ سب مبلغ (مشنری) اور پادری ہیں اور کلیسا کے مذہبی عہدہ دار ہیں۔ انہیں بیش قرار تنخواہیں کلیسا اور اوقاف کلیسا سے ملتی رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک مسیحی راہب اور کلیسا کا عہدہ دار کلیسا کی تنخواہ لے کر اسلام پر تحقیقات کسی مقصد اور کسی جذبہ کے ماتحت کر سکتا ہے۔ اور یورپ کی استعماری حکومتوں نے ان پر جو کروڑوں روپے خرچ کئے یا کر رہی ہیں۔ ان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔؟ عربی زبان سے ریاضیات، فلکیات، کیمیا۔ طب نباتیات اور حیوانیات کی کتابوں کے ترجمے کرنے والوں کو شاید یہ کہہ دیا جائے کہ محض تلاش علم کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں یا کرتے رہے ہیں۔ لیکن ایسے حضرات بہت ہی کم ہیں اور ہمارے موضوع سخن سے اس مقالہ میں یہ لوگ خارج ہیں۔ اسلامی عقائد۔ قرآن حکیم۔ اسلامی تاریخ، سیرۃ رسولؐ اور اسلامی تصوف پر تحقیقات کرنے والے ان مسیحی خانقاہ نشینوں اور مبلغوں کا مقصد صرف تلاش علم و ہنر کیسے ہو سکتا ہے۔؟

مستشرقین کی اسلامی تحقیقات کا مقصد جو ان کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ۔ استعمار کے لئے راستہ کی ہمواری اور مسلمانوں میں تفریق پھیلانے کی جدوجہد کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس مقصد کے لئے۔ وہ بڑے خلوص اور تندہی سے کام کرنے

ہیں۔ تحقیق کے نام سے منافقوں اور اسلام دشمن اشخاص کے قدیم اقوال ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں۔ اور چونکہ عرب عیسائیوں اور یہودیوں کے اکثر نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں۔ اس لئے بڑی آسانی کے ساتھ وہ دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مسلمان حکومتوں میں ہمیشہ سے آزادی رائے دی ہے۔ اس لئے ہزاروں یہودیوں اور عیسائیوں نے طرح طرح کی فضول اور مضر تحریریں لکھی ہیں اور آج یہ تحریریں اسی طرح پیش کی جاتی ہیں۔ جیسے کسی مسلمان عالم دین کی لکھی ہوئی کتاب ہو۔ اس کے علاوہ خود مسلمانوں میں کچھ لامذہب اور زندیق قسم کے افراد بھی داخل یا پیدا ہوتے رہے ہیں، یہ لوگ ان کی تحریروں پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ مثلاً بشار بن برد، ابونواس جیسے مشاہیر فساق اور زنادقہ کی تحریریں کتاب الاغانی کتاب اخوان الصفا ابونعیم کی کتاب الفتن اور اس قسم کی دوسری کتابوں سے مواد لیتے ہیں۔ بعض بالکلیہ جعلی کتابیں جو کسی قدیم مصنف کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن ابن داؤد کی طرف منسوب کتاب "المصحف" زبیر بن بکار کی طرف منسوب کتاب "نسب قریش" بوعلی سینا کیطرف منسوب رسالہ "حشر الاجساد" وغیرہ ان کے مقاصد کے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ متون کتاب کی طباعت و اشاعت میں انہوں نے جو کام کیا ہے فہرست سازی اور اشاریہ نویسی میں جو محنتیں انہوں نے کی ہیں وہ لائق صد آفریں ان کی محنت و مساعی نے بہت سی نایاب اور قیمتی کتابیں چھپ کر ہمارے لئے قابل حصول ہو گئیں۔ لیکن جہاں انہوں نے ترجمہ و تفسیر کا کام کیا ہے یا بطور کوئی کتاب لکھی ہے۔ وہاں کبھی بالارادہ اپنے جذبہ عداوت کے ماتحت اور کبھی محض اپنی جہالت سے کتاب کو کیا سے کیا بنا کے بھی رکھ دیا ہے اور عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ مثال کے لئے مشہور مستشرق فلوگل کو لیجئے انہوں نے قرآن مجید کا ایک نسخہ چھاپا الفاظ کی فہرست مرتب کی اور ۱۸۴۲ء میں ایک وسیع لغت الفاظ قرآن مجید کا شائع کیا۔ اس لغت میں انہوں نے ۳۹ الفاظ کے غلط عربی مادے لکھ دئے اور نتیجۃً معانی بدل ڈالے۔ مثال کیلئے ان پانچ الفاظ کو دیکھئے۔

۱۔ اثرن کا مادہ "ا۔ ث۔ ر" قرار دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ث۔ و۔ ر ہے۔

۲۔ المخاص کا مادہ "خ۔ و۔ ص" قرار دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل م۔ خ۔ ص ہے۔

۳۔ استبقوا کا مادہ "ب۔ ق۔ ی" قرار دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل س۔ ب۔ ق ہے۔

۴۔ وقرن۔ کا مادہ "ق۔ ر۔ ن" قرار دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ق۔ ر۔ ر ہے۔

۵۔ مقیلا کا مادہ "ق۔ و۔ ل" قرار دیا۔ حالانکہ اس کا صحیح مادہ فعل ق۔ ی۔ ل ہے۔

اس تبدیلی سے معانی بالکل بدل گئے۔ یہ وہ مسٹر فلوگل ہیں جن کو مستشرقین کے نزدیک سندِ مستند کا مقام حاصل ہے۔

چونکہ ہمیشہ سے یہ اعتراض مسیحیت پر کیا جاتا رہا ہے کہ انجیل مقدس کے نام سے جو کتاب پیش کی جاتی ہے وہ حضرت عیسیٰ کی غلط اور فرضی سوانحعمری ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی وحی الہٰی کا نہیں ہے۔ اور یہ اعتراض بالکل صحیح ہے دنیا میں کہیں وحی الہٰی کا ایک لفظ بھی بجز قرآن مجید کے موجود نہیں ہے۔ یہ امر واقعہ ہے اس کا کوئی جواب عیسائی مبلغین کے پاس نہیں ہے۔ اس لئے مستشرقین نے اپنی تحقیقات اسلامی کا سارا زور اس پر لگا دیا ہے کہ قرآن مجید بھی اصلی نہیں ہے۔ اور قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہ عجیب عجیب دلائل پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً علامہ گولڈ زیہر اپنی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے ایک لفظ کی صحت بھی قابلِ اعتماد نہیں۔ کیونکہ ابتداً جب اسے لکھا گیا تو حروف پر نقطے نہیں تھے۔ اس لئے لوگوں نے نہ جانے کیا لکھا تھا اور کیا پڑھا۔

ذرا غور فرمائیے اس فاضل مستشرقین نے کیا بات پیدا کی ہے۔ جس قوم میں مادر زاد اندھے حافظ رہے ہوں اور جس میں آج تک استاد سے شاگرد کی طرف علم کی منتقلی بذریعۂ صورت و آواز ہو اس میں نقطہ کی اہمیت کیا ہے۔ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے آواز سنتے تھے۔ یا لکھی ہوئی تحریروں سے قرآن مجید یاد کرتے تھے۔ اور آج تک کسی مسجد اور کسی مدرسہ میں قرآن مجید بغیر معلم کی آواز کے بلیک بورڈ پر لکھ کر پڑھا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی آواز۔ مد۔ سکون۔ وقف۔ سکتہ یہ سب کچھ بذریعہ روایت محفوظ ہے اس کے لئے حروف اور نقطہ کی ضرورت بھی کہاں پڑتی ہے۔؟
شاید علامہ گولڈ زیہر کا مقصد یہ ہے کہ جب وحی آتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لکھوا کر اس لئے محفوظ فرما دیتے تھے کہ لوگ آ کر مسجد میں رکھے ہوئے اس نوشتہ کو پڑھ لیا کریں۔ اور آپ کسی کو زبان سے کچھ نہیں سنایا کرتے تھے۔

یہی ہوتا تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابی نے قرآن مجید کیسے یاد کیا۔ اور ناحرف شناس تو بہت سے حافظ قرآن صحابہؓ میں موجود تھے۔

اسی طرح کی مہمل دلیلوں اور مغالطوں کے ذریعہ حضرات مستشرقین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تورات شریف اور انجیل مقدس کی طرح قرآن مجید بھی دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اسی طرح سیرۃ طیبہ اسلامی تاریخ اور تمدن اسلامی میں طرح طرح کے شک پیدا کرنے کی کبھی بالارادہ کوششیں کرتے ہیں۔ اور کبھی نقص مطالعہ اور غرور علم و فضل کی آمیزش سے ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں

سنیئے ایک مبلغ اور مستشرق ہیں "لوئی وانڈرمین" انہوں نے ایک علمی مجلس میں یہ اعتراض کیا کہ ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر حضرت زبیرؓ اکثر جاتے تھے اور کبھی کبھی وہیں سو بھی جاتے تھے۔ ام المومنین ان کے سر میں کنگھی بھی کر دیتی تھیں حالانکہ اسلام میں کسی عورت کا غیر مرد سے اس طرح خلا ملا جائز نہیں ہے۔ اس اعتراض کے بعد جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰ حضرت زبیرؓ کی حقیقی پھوپھی تھیں اور ان ہی نے بچپن سے ان کو پالا تھا۔ کوئی غیر نہ تھیں تو نہایت معصومیت سے فرمایا: "اچھا یہ بات ہوگی۔"

مثالوں سے بات بڑی طویل ہو جائے گی۔ اس لئے اب میں اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے:-

۱۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو ہمیشہ ہی سے اس کا صدمہ رہا ہے کہ اسلام نے شام و عراق، مصر و مراکش وغیرہ میں کیوں قدم جمائے، اس کا انتقام لینے کیلئے انہوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا اور کام لے رہے ہیں، اور ہمیشہ کام لیتے رہیں گے۔ مسلمانوں کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ شکایت کرنا بزدلی ہے۔ اور چوکنا رہنا ہوشیاری اور دانائی ہے۔

۲۔ عیسائی مبلغین جو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں وہ کسی مذہب کے مبلغ نہیں ہیں۔ کبھی وہ استعماری حکومتوں کے ہراول دستہ تھے اور اب یورپین تہذیب و تمدن کے نقارچی ہیں۔ جنہیں بیش قرار تنخواہیں سیاسی مصالح اور تجارتی مقاصد کی تکمیل کے لئے دی جاتی ہیں۔ یہ مبلغ بھی ہوتے ہیں۔ اور پروفیسر بھی۔ اور کبھی کوئی اور روپ بھی دھار لیتے ہیں۔

۳۔ کسی کی بات کو بغیر تنقیح و تحقیق کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مستشرقین کے علم و فضل سے مرعوب ہو کر کوئی بات قبول کی جا سکتی۔ رہی اچھی اور سچی بات تو یہ دوست سے ملے یا دشمن سے، کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدت فھو احق بھا۔ (کلمہ حق مومن کا کھویا ہوا مال ہے، جہاں کہیں مل جائے مومن ہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔) ■■

علامہ شمس الحق افغانی مدظلہٗ ۔ جامعہ اسلامیہ ۔ بہاولپور

خداوند تعالیٰ کے وجود پر

فلاسفہ اور ائمہ اسلام کے دلائل

اسلام کے بنیادی اصول اور سائنس

قسط ۲

اس سے قبل جو بارہ دلائل اثبات وجود باری پر پیش کئے گئے وہ فلسفہ جدید کے تحت پیش کئے گئے، جن کو سائینسی دلائل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم فلسفہ یونان کی اکثریت وجود باری کی قائل ہے، اور انہوں نے اپنے فلسفہ کی روشنی میں اثبات باری تعالیٰ پر دلائل پیش کئے۔

دلیل حدوثی ۱۔ حدوثی دلیل جس کا حاصل یہ ہے کہ کل کائنات کی حقیقت یا جسم ہے۔ جیسے عناصر اربعہ باد، خاک، آب و آتش۔ افلاک، ستارے، مرکبات، معدنیات، نباتات، حیوانات، انسان یا جسم سے قائم چیزیں مثلاً گرمی سردی، سختی نرمی، سیاہی سفیدی، اور جسم حادث یعنی نو پیدا ہے۔ کیونکہ ہر جسم مرکب ہے، یعنی اجزاء کے جوڑ سے پیدا ہوا ہے، اور جس چیز کے لئے جوڑ ہو اس کے لئے توڑ بھی ہوتا ہے اور توڑ سے مرکب کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے جسم حادث اور قابل عدم ہے۔ اس کے علاوہ جسم تغیر پذیر ہے۔ کبھی گرم کبھی سرد کبھی نرم کبھی سخت کبھی سیاہ کبھی سفید ہے۔ اور جس چیز میں صفات کا تغیر ہوتا ہے اس میں عدم اور وجود کا تغیر بھی آسکتا ہے کہ معدوم سے موجود اور موجود سے معدوم ہو جائے۔ اس لئے جسم حادث ہے اور مادہ میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، لہٰذا وہ بھی حادث قرار پایا۔ جب عالم حادث ٹھہرا، تو اس کے لئے احداث اور ایجاد کرنے والا ضروری ہے۔ اگر عالم کا موجد بھی حادث ہو تو اس کے لئے بھی پیدا کنندہ اور محدث کی ضرورت ہوگی اسی طرح تسلسل لازم آئے گا، یعنی لامتناہی سلسلہ کا وجود جو دونوں فلسفوں کے لحاظ سے محال ہے۔

لہذا محدث عالم ایسی ذات ہوگی جو حادث نہ ہو بلکہ قدیم ہو۔ اور اس ذات کے لئے ضروری ہوگا کہ علم و حکمت سے موصوف ہو، کیونکہ اس قدر عظیم پُر حکمت عالمی مشین کے لئے کسی بے سمجھ ہستی کا کام نہیں۔ جبکہ معمولی میز بھی بے سمجھ جماد یا حیوان نہیں بنا سکتا۔ اور اس ذات کا حیات اور ارادہ کے اوصاف سے موصوف ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ حیات اور ارادے کی صفتوں کو انسان میں پیدا کر سکے۔ ایسی ذات صرف خدا ہے، لہذا خدا کا وجود ثابت ہُوا۔

دلیل امکانی | ۲۔ فلسفۂ یونان کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اور جدید فلسفہ بھی اس سے متفق ہے کہ جب وجود کو کسی چیز کی طرف منسوب کیا جائے یا عدم کو۔ تو یا اس چیز کا وجود یعنی ہونا ضروری ہوگا، یا عدم اور نہ ہونا ضروری ہوگا۔ ہونا اور نہ ہونا دونوں غیر ضروری ہونگے۔ پہلی چیز کا نام واجب الوجود یعنی خدا ہے۔ دوسری چیز کا نام محال اور ممتنع ہے جیسے دو دونے پانچ یا دو نقیضوں مثلاً ایک کپڑے کا بیک وقت سیاہ و سفید ہونا۔ تیسری چیز ممکن ہے، مثلاً انسان کا کوئی فرد مثلاً زید کہ اس کا ہونا نہ ہونا دونوں ضروری نہیں اگر ہونا ضروری ہوتا، تو اس کے وجود سے پہلے اس کا عدم نہ ہوتا۔ اور مرنے کے بعد بھی اس کا عدم نہ ہوتا۔ اور عدم بھی ضروری نہیں ورنہ زید کبھی بھی موجود نہ ہوتا۔ اس لئے تمام کائنات تیسری قسم یعنی ممکنات میں داخل ہیں کہ اُن کا ہونا بھی ضروری نہیں اور نہ ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ کائنات کا ہونا نہ ہونا کسی علت کی وجہ سے ہوگا، لیکن وہ علت اور سبب کائنات ممکن نہ ہوگا، ورنہ اس کے لئے دوسری علت کی ضرورت ہوگی۔ اور لامتناہی سلسلہ کا وجود لازم آئے گا۔ جو محال ہے۔ تو ضرور وہ علت واجب الوجود ہوگی۔ اور وہی خدا ہے۔ ممتنع کا تو خود وجود نہیں اس لئے وہ کسی ممکن کو وجود قطعاً نہیں دے سکتا۔

دلیل بالذاتی | ۳۔ ممکنات عالم کے لئے وجود یا اس کی ذاتی صفت ہوگی اور خانہ زاد ہوگی۔ یا عارضی اور بیرونی علت کی وجہ سے وجود ممکنات میں آیا ہوگا۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔ پہلی صورت صحیح نہیں، کیونکہ ذاتی صفت لازوال ہوتی ہے۔ اور موصوف سے زائل نہیں ہوتی۔ جیسے آگ کی گرمی کہ آگ سے جدا نہیں ہوتی۔ جب تک آگ ہوگی تو گرمی ضرور ہوگی، لیکن ممکنات عالم سے وجود الگ ہو سکتا ہے انسان نبات میں ہر ایک کبھی موجود ہے تو کبھی نہیں، جو ان تینوں کا حال وہ تمام اجسام عالم اور کائنات کا بھی حال ہے کہ سب ممکن ہے، اور سب اجسام ہیں تو جب وجود کی جدائی انسان حیوان نبات سے ہو سکتی ہے تو دیگر ممکنات سے بھی ہو سکتی ہے تو کائنات اور ممکنات کی حالت وجود کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے گرمی پانی کے لئے کہ پانی کے

ساتھ کبھی گرمی ہوتی ہے، جبکہ اس کو گرم کیا جائے۔ اور کبھی نہیں ہوتی جب ٹھنڈا ہو۔ لہٰذا ممکنات ذاتی صفت نہیں عرضی ہے۔ جیسے پانی کی گرمی عرضی صفت ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اسی عرضی صفت کی علت سے سوال کیا جائے۔ مثلاً پانی کے متعلق یہ سوال ہو سکتا ہے کہ پانی کیوں گرم ہے کیونکہ گرمی پانی کی ذاتی صفت نہیں لہٰذہ گرمی کی علت سے سوال کیا جا سکتا ہے۔ جسکا جواب یہ ہوگا کہ آگ نے پانی کو گرم کیا ہے۔ لیکن آگ کے متعلق یہ سوال غلط ہے کہ آگ کیوں گرم ہے، کیونکہ گرمی آگ کی ذاتی صفت ہے اور ذاتی صفت ذات کے ساتھ لازم ہوتی ہے کہ کسی علت کی وجہ سے ذات میں نہیں ہوتی اسی طرح ممکنات کا وجود چونکہ ذاتی نہیں لہٰذہ سوال ہوگا۔ کہ ممکنات عالم کیوں موجود ہیں۔ جواب یہ ہوگا۔ کہ واجب الوجود خدا نے اس کو وجود دیا اور اسی کی وجہ سے موجود ہیں، تو آگے سوال نہ ہوگا، کہ واجب الوجود کیوں موجود ہے۔ کیونکہ آگ کی گرمی کیطرح وجود خدا کی ذاتی صفت ہے کہیں عارضی نہیں، لہٰذا ممکنات کے وجود کا سوال اس وجود کی علت یعنی خدا پر ختم ہوا اور خدا کے وجود کا سوال بالذات ہونے کی وجہ سے کیونکہ ذریعہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وجود باری تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ کسی بیرونی علت سے اسکی آمد نہیں ہوئی اس لئے خدا کی ہستی ثابت ہوئی۔

۴۔ دلیل نفسیاتی حُبّی | محبوبات کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل محبوب غیر کامل مثلاً جان، مال، اولاد، بیوی اور عزت وجاہ۔ یہ محبوبات اس لئے غیر کامل ہیں کہ زوال پذیر ہیں۔ محبوبِ کامل رب العالمین جو تمام محبوبات غیر کاملہ اور تمام انسانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور غیر کامل محبوب کی محبت محبوبِ کامل کی نسبت ناقص ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انسان نے اللہ کی محبت کی راہ میں ان پانچ محبوباتِ غیر کاملہ جان، مال، اولاد، بیوی اور جاہ کو قربان کیا ہے۔ کیونکہ کامل محبوب کی راہ میں ناقص محبوب کی قربانی ایک فطری امر ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ محبتِ غیر کاملہ کا محبوب موجود ہے، جان مال اولاد بیوی عز وجاہ سب موجود ہیں۔ کیونکہ معدوم چیز محبوب بن نہیں سکتی۔ تو محبوب کامل یعنی خالق عالم کیونکر معدوم ہوگا۔ جبکہ معدوم محبوب بننے کے قابل نہیں۔ لہٰذا محبوبِ کامل زندہ اور موجود ہے محبوبِ ناقص اس کے مقابلہ میں مردہ کی طرح ہے۔ بقول حضرت رومیؒ ؎

عشق با مردہ نباشد پائدار　　عشق را با حیّ و با قیوم دار

غرق عشق شو کہ غرق ہست اندریں　　عشق ہائے اولین و آخرین

۵۔ نفسیاتی دلیل التجائی | دنیا میں کمزور، ضعیف اور مظلوم افراد کی تعداد زیادہ ہے اور قوی ظالم افراد کی تعداد کم ہے۔ جو ضعیفوں پر ظلم کرتے ہیں۔ لیکن ان سے مظلوم انتقام نہیں لے سکتا۔

اس لئے اگر قاہر وجابر قوت یعنی ذاتِ باری تعالیٰ کا عقیدہ اور تصوّر موجود نہ ہو۔ تو مظلوم کے لئے کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ اور مظلوم کا دل نا امیدی اور قنوطیّت کے باعث ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کے ضعف اور ٹوٹے ہوئے دل کے لئے کوئی سہارا نہ رہے گا، جس سے اسکی قلبی قوّت فنا ہو جائے گی۔ اس لئے عقیدہ ثبوت باری فطرت کا تقاضا ہے۔ تاکہ وہ مظلوموں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے مرہم کا کام دے۔ اور اس کو نا امید نہ ہونے دے۔ اور ان کو اس جذبہ کے تحت آمادہ عمل کر دے کہ اللہ کی قوت انقلاب پیدا کر کے اسکی امداد کرے گی۔ لہذا نا امید نہ ہوں۔ اور جوشِ عمل کو زندہ رکھیں۔ اسی عقیدہ اثباتِ باری نے ہمیشہ انسانی تاریخ میں بےکسوں اور مظلوموں کو جرأت دلائی ہے۔ اور اسی نے مظلوموں کو طاقت ور ظالموں پر غالب کیا ہے۔

۶۔ دلیل عزقی نفسیاتی | ذیل کے چھ دلائل بزرگانِ دین نے عام فہم سائینس کی شکل میں ارشاد فرمائے ہیں جو تفسیر کبیر میں مذکور ہیں، جن میں سے ایک دلیل عزقی ہے۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا۔ کہ خدا کے وجود پر کیا دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم سمندر میں کشتی پر سوار ہو اور کشتی ایسی ٹوٹ جائے کہ اسکی ایک تختی بھی تمہارے ہاتھ میں باقی نہ رہے۔ اور ڈوب جانے کا قوی خطرہ پیدا ہو جائے تو کیا اس وقت بھی تم کو غرق ہونے سے بچنے کی کوئی امید باقی رہتی ہے کہا کہ امید تو باقی رہتی ہے۔ فرمایا کہ امید کا ظاہری سہارا تو موجود نہیں پھر بھی امید باقی ہے۔ یہ امید پوشیدہ جس سہارے کی وجہ سے باقی ہے وہی خدا ہے۔ جو ضمیر کی گہرائی میں موجود ہے۔

۷۔ دلیل فلکی | امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو ایک ملحد کے ساتھ مناظرہ میں بلایا گیا۔ وہ مناظرہ کرنے کے لئے دیر سے پہنچے۔ آپ سے تاخیر کی وجہ پوچھی گئی۔ آپ نے فرمایا میرا مکان دریائے دجلہ سے پار تھا، کشتی موجود نہ تھی، انتظار کیا۔ یہاں تک کہ درخت کٹ کر کشتی خود بخود تیار ہوئی۔ پھر خود بخود میرے پاس کنارے پر پہنچی۔ میں سوار ہوا، تو خود بخود چلنے لگی، یہاں تک کہ میں پار ہوا۔ ملحد نے کہا کہ یہ پاگلوں کی سی باتیں ہیں۔ کشتی نہ خود بخود بن سکتی ہے نہ ملاح کے بغیر خود بخود چل سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تیری عقل میں فتور ہے۔ امام اعظمؒ نے فرمایا اس سے بڑا پاگل پن تم میں موجود ہے کہ جب چھوٹی سی کشتی کے لئے خود بن جانا اور خود بخود چلنا نامعقول ہے، تو کائنات کی یہ عظیم الشان کشتی خود بخود کیسے بنی اور خود بخود کیسے چل سکتی ہے۔ ملحد لاجواب ہوا۔ اور خدا کی ہستی کا اُسے اقرار کرنا پڑا۔

۸۔ دلیل صوتی | امام مالکؒ سے باری تعالیٰ کے وجود پر دلیل دریافت کی گئی۔ آپ نے آوازوں کے اختلاف سے وجود باری تعالیٰ پر استدلال کیا جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام اولادِ آدم میں سے ہر فرد

کی آواز دوسرے سے مختلف ہے۔ اور آج تک اور اسی طرح آئندہ بھی دو آدمیوں کی آوازیں ایک جیسی ہو بہو نہیں۔ حالانکہ جس ہوا کے تموج سے آواز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک ہے گلے کی ساخت بھی ایک جیسی ہے۔ کروڑوں اور اربوں آوازوں میں یہ باریک فرق خدائے حکیم کی بہترین صنعت کاری کی دلیل ہے۔ اور یہ ایک ایسا عمل بے شعور مادہ سے منسوب کرنا نادانی ہے۔

۹۔ دلیل توتی | امام شافعیؒ سے جب وجود باری تعالیٰ کی دلیل طلب کی گئی۔ تو آپ نے درخت توت کے ورق اور اس کے پتہ کو دلیل میں پیش کیا۔ کہ توت کی پتی ایک جیسی ہے، لیکن جب اس کو اونٹ کھاتا ہے تو اس سے مینگنی پیدا ہوتی ہے۔ اور ریشم کا کیڑا اس کو کھاتا ہے تو اس سے ریشم پیدا ہوتی ہے۔ اور جب شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد پیدا ہوتا ہے۔ اور جب آہو ختن اسے کھاتا ہے تو اس سے مشک اور کستوری پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ دلیل بیضی | امام احمدؒ سے ثبوت باری کی دلیل دریافت کی گئی تو آپ نے مرغی کے انڈے سے بچہ نکالنے پر استدلال کیا۔ انڈوں پر مرغی بیس۲۰ اکیس۲۱ دن بیٹھتی اور آزادانہ نقل و حرکت ترک کرتی ہے جو اگر دوسرے وقت میں کوئی زبردستی کسی جگہ بیٹھنے کا مرغی کو پابند کرنا چاہے تو پابند نہ ہوگی۔ پھر اس مرغی کو یہ بتلانا کہ انڈے میں بچہ نکلنے کا وقت پہنچ گیا ہے۔ پھر مرغی کا اس بچے کو غذا پیش کرنا اور سردی سے بچاؤ اور خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے بال و پر کے نیچے چھپائے رکھنا یہ سب الہامات الٰہیہ جو خدائے حکیم مرغی کے دل و دماغ میں ڈالتا ہے۔ سب وجود باری تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۱۔ دلیل نباتی | ابونواس اور سعدی رحمہما اللہ علیہما نے نباتات سے خدا کی ہستی پر استدلال کیا ہے۔ ابونواسؒ نے کہا ؎

تامل فی نبات الارض وانظر — الی آثار ما صنع الملیک۔
عیون من لجین شاخصات — وازھار کما الذھب السبیک
علی قضب الزبرجد شاھدات — بان اللہ لیس لہ شریک

سعدیؒ کہتے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار — ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

نباتات کا تخم ایک، پانی ایک، مٹی ایک، پھر اس میں سے کچھ جڑ کچھ پوست کچھ شاخ کچھ پھول اور کچھ تنہ و خار بن جاتے ہیں۔ یہ مختلف کاریگری صانع حکیم کا فعل ہے، جو خدا ہے۔

۱۲۔ دلیل عنکبوتی | مکڑی کے جالے کا ہر ایک تار چار تاروں سے مرکب ہے۔ اور ان چار تاروں میں سے ہر ایک چار ہزار تاروں سے مرکب ہے۔ یعنی ہر ایک تار سولہ ہزار تاروں کا مجموعہ ہے۔ اور پھر انتہائی باریک ہے۔ اگر کسی بڑے انجنیئر کو وہ مادہ دیا جائے جس سے وہ تار بنتا ہے تو وہ ہرگز نہیں بنا سکے گا۔ کیونکہ اس قدر حقیر اور کم مادہ سے سولہ ہزار تاروں کا مجموعہ ایک باریک تار بنا دینا بڑا عظیم کارنامہ ہے، پھر اس جالے میں مختلف ہندسی اشکال ہیں۔ کیا یہ تمام کاروائی جو مکڑی جالا بنتے وقت وجود میں لائی یہ بغیر الہام الٰہی کے ممکن ہے۔؟ ہرگز نہیں۔ اس لئے باری تعالیٰ کا وجود ثابت ہوا۔ (تفسیر طنطاوی ص۲ج۶)

۱۳۔ دلیل لسانی | اولادِ آدم جو زمین پر آباد ہے، وہ اپنے مقصد کو اپنی زبان کے ذریعہ ظاہر کرتی ہے۔ جو اس نے اپنے والدین سے سیکھی ہے۔ والدین نے اپنے والدین سے علی ہذا القیاس اوپر تک زبان سیکھنے کا یہ سلسلہ پہنچتا ہے۔ اب اوّل انسان جس پر دونو فلسفوں کا قدیم ہو یا جدید اتفاق ہے کہ پہلا انسان جس سے پیشتر اور کوئی انسان نہ تھا۔ وہ خواہ دستِ قدرت سے پیدا ہوا یا بقول ڈارون بشکل ارتقاء، دونو صورتوں میں سوال ہوگا کہ اوّل انسان نے بولی اور زبان کس سے سیکھی کیونکہ اس سے پیشتر تو کوئی انسان تھا ہی نہیں۔ تو جواب یہی ہوگا۔ کہ پہلے انسان کو زبان اور بولی کا علم خداوند تعالیٰ کے الہام سے حاصل ہوا۔ اس لئے خدا موجود ہے۔

۱۴۔ دلیل ارتقائی | انسان قدرت کا شاہکار ہے لیکن حیات ایک شعلہ ہے۔ جو موت کے ایک جھونکے سے ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ابدیتِ حیات ضروری ہے جس کی تحصیل کے لئے پانچ منازل کو طے کرنا لازمی ہے۔

۱۔ شخصی انا ۔ ۲۔ ملی انا ۔ ۳۔ انسانی انا ۔ ۴۔ کائناتی انا ۔ ۵۔ الٰہی انا ۔

شخصی انا کا مقصد یہ کہ شخص کی حرکات و اعمال کے لئے ایک بلند مقصد متعین کیا جسکی وجہ سے جذبات کی تحدید پیدا ہو۔ اور اعمال کا تناقض رفع ہو۔ قرآن نے واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ۔ کے ذریعہ جذبات وخواہشاتِ شخصی کو خوفِ مجازات اعمال کے تحت محدود کیا ہے۔ اور اعمال میں تناقص رفع کر کے یگانگت پیدا کی۔ اور اس کے لئے مقصد تعمیر شخصیت برنگ صلاح متعین کیا۔

ملی انا کے لئے افراد ملت کے تناقض اعمال کو ختم کرنا ہے اور شخصی مفادات کو ملت کے مفاد اجتماعی میں مدغم کر کے مقصد ملت کو متعین کرنا ہے۔ قرآن نے اسی ملی انا کے مقصد کو اس آیت

واضح کیا ہے: وتعاونوا بالبر والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ کہ افرادِ ملت کا جملہ تعاون حق کے لئے صرف ہو اور تعاونِ باطل سے کنارہ کش ہوں۔

انسانی انا کا مقصد یہ ہے کہ تمام اقوام عالم کے مقاصد کو ایک عظیم انسانی مقصد کے تحت منظم کیا جائے اور واحد انسانی مفاد کو تمام افراد انسان کے لئے نصب العین قرار دیا جائے۔ تاکہ بین الاقوامی متضاد مفادات ایک ہی انسانی مقصد عظیم کے تحت منظم ہو کر سب انسانوں میں فکر و عمل کی یگانگت پیدا کر کے اقوام عالم کے باہمی فسادات اور محاربات کا خاتمہ کیا جائے۔ قرآن نے اسی وحدتِ مقصد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔" اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ماں باپ سے پیدا کیا۔ اور بنایا تم کو قومیں اور ذاتیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان لو بیشک تم میں عزت مند وہ ہے۔ جو سب سے زیادہ پابند حق ہو۔

اس آیت میں وحدتِ بشری کا اعلان ہے۔ کہ سب انسان درحقیقت ایک ماں باپ آدم و حوّا علیہما السلام کی اولاد ہے۔ اور سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ ایک اللہ کی زمین پر آباد ہیں۔ لہٰذا سب انسانی مصلحت کے لئے کوشاں رہیں۔ نسلی اور جغرافیائی تفریق سے بچیں۔ کہ یہ تفریق محض تعارفی ہے۔ تمہاری نہیں جسکی وجہ سے تم جنگیں برپا کرو۔ عزت، غلبہ، اور قوت سے وابستہ نہیں۔ انصاف اور حق پرستی سے وابستہ ہے۔ یہ وہ انسانی انا ہے، جس سے تمام اقوام ایک انسانی وحدت میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اور تمام مظالم اور خونریزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کائناتی انا:- تمام کائنات عالم بھی ایک وحدت ہے، جو انسان کی منفعت اور خدمت کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض۔ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات عالم کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ لہٰذا اس کو مفاد انسانی میں صرف کرنے کی کوشش کرو۔ تعصب استعمار اور اختصاصِ فوائد کے مذموم مقصد سے اجتناب کرو۔ اور کائناتِ عالم کے بیشمار فوائد کو نفعِ انسانی کے عمومی فائدہ بھی مدغم کرو۔

الٰہی انا:- اس کائناتی انا کے بعد الٰہی انا کیطرف انتقال کرو۔ وہ یہ ہے کہ تمام اقوام دائمہ اور افراد بشر کائناتی مقصد مشترک کو رضاء الٰہی کے مقصد مشترک میں مدغم کر دیں۔ سب کی حرکات و اعمال رضاء الٰہی کے مقصد اور اس کے قانونِ عدل کی اطاعت میں صرف ہو جس کا واحد ذریعہ ایمان و عمل صالح ہے۔ اس سے انسان کائناتِ عالم سے بلند ہو کر خالقِ کائنات سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حیاتِ فانی اپنے خالق سے مشابہت اور مناسبت کی وجہ سے حیات ابدی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اللہ ابدی کیطرح انسان اپنی زندگی کو ابدی بنا سکتا ہے۔ ❊

(باقی آئندہ)

جناب اختر راہی ایم اے

علامہ انور شاہ کاشمیری اور اقبال

ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک نامور شاعر اور بلند پایہ مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے دقیق النظر عالم بھی تھے۔ انہوں نے زندگی کا ایک حصہ اسلامیات کے مطالعہ میں گزارا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلامی بصیرت عطا کی جو ان کے کلام میں روح کی حیثیت سے جاری وساری ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کا دورانِ تعلیم میں فلسفہ کی طرف رجحان زیادہ رہا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور بعد ازاں جرمنی سے "فلسفہ عجم" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مرحوم نے قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کے فلسفیانہ سرمایہ پر تنقیدی نظر ڈالی تھی اور فلاسفہ کی ایں و آں سے باخبر تھے۔

ایک عرصہ ڈاکٹر مرحوم کی توجہ فلاسفہ کے پسندیدہ موضوع "مسئلہ زمان ومکان" پر مرکوز رہی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ارسطو اور زینو (Zeno) سے لیکر نیوٹن (Newton) تک کے خیالات پر تحقیقی نظر ڈالی اور ساتھ ہی مسلم مفکرین اور صوفیاء کے خیالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر مرحوم نے مدراس میں خطبات دئے جو ۱۹۳۰ء میں "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" (Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) کے نام سے شائع ہوئے — ان خطبات کا بیشتر حصہ اسی تصور زمان ومکان کی تشریح وتوضیح پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کے ہاں "مسئلہ زمان ومکان" کی جو اہمیت تھی وہ ان کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

" اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل

ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل ہوں۔ سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمولیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا یہ مطمح نظر ہو اس میں زمان و مکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔ (خطبات "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" ص۱۸۱)

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے خطبات میں مسلم علماء کے مختلف نظریات اور مکاتب خیال ـــ (Schools of thoughts) کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اشاعرہ معتزلہ وغیرہ سے تفصیلی بحث کی ہے اور خاص کر الاشعری (م)، ابن حزم (م ۴۵۶ھ) طوسی (م ۶۷۲ھ) اور عراقی (م) کے افکار کو غور و فکر کا موضوع بنایا ہے۔

ڈاکٹر مرحوم نے معاصر اہل علم سے اس سلسلے میں خاصا استفادہ کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی (م ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳) سے جو خط کتابت ہوئی "اقبالنامہ" میں درج ہے۔ مزید برآں احباب سے گفتگو اور بات چیت کے ذریعے "تصور زمان و مکان" کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مولانا ظفر علی خانؒ (م ۱۹۵۶) کے بقول علامہ عبداللہ العمادی (م) مشہور مسلم صوفی ابن عربی (م) کے افکار و نظریات کی تدریس کے لئے ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ (نقوش شخصیات نمبر حصہ دوم ص۸۲۰)

ڈاکٹر صاحب نے خطبات مدراس کے دوران میں سید انور شاہ کاشمیریؒ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اور اس استفادے کا اندازہ شاہ صاحب کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے کہ "مجھ سے جتنا استفادہ ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا۔" [انوار الوری۔ (محمد انوری مرحوم) ص۱۰۴]

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کی پہلی ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی رقمطراز ہیں :-

"جمعیت علمائے ہند کا ایک عظیم الشان جلسہ ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقد ہوا جس کے روح رواں ہمارے ہر دلعزیز مرحوم مولوی عبدالقادر قصوری تھے ـــ راقم (ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب) نے اتنے علماء دین کا مجمع پھر کبھی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ کم سے کم ہندو پاکستان کی تاریخ میں اتنا بڑا جلسہ اس کے بعد نہیں ہوا حسن اتفاق سے اس جلسہ میں راقم (عبداللہ چغتائی صاحب) کی معرفت علامہ اقبال کا تعارف حضرت انور شاہ اعلی اللہ مقامہٗ سے پہلی مرتبہ ہوا تھا ـــ

(روزنامہ "نوائے وقت" راولپنڈی ۱۹ر مئی ۱۹۶۶ء ص۱)

اس کے بعد علامہ انورشاہ صاحب انجمن خدام الدین کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۵ء میں لاہور تشریف لائے۔ انجمن خدام الدین کے روح رواں شیخ التفسیر مولانا احمد علی مرحوم (۱۳۸۱ھ) تھے اس انجمن کے سالانہ جلسہ میں علامہ انورشاہ کے علاوہ حبیب الرحمٰن عثمانی (م) مولانا شبیر احمد عثمانی (م ۱۹۴۹ء) اور مفتی عزیز الرحمٰن وغیرہ بھی شریک تھے۔ جب علامہ اقبال کو ان حضرات کی آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو علامہ نے شاہ صاحب کو دعوتِ طعام دی۔ رقعۂ دعوت درج ہے:

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ ـــــ مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرمائیں گے۔ میں اسے اپنی سعادت تصور کروں گا۔ اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، قبلہ عثمانی صاحب، حضرت مولوی شبیر احمد عثمانی صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے۔ مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ (اقبال نامہ حصہ اوّل ص۳۵)

مخلص

محمد اقبال

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی علامہ انورشاہ صاحب کیساتھ یہ عقیدت درحقیقت شاہ صاحب کے فضل و کمال کی تائید ہے۔ ڈاکٹر مرحوم جو مسئلہ زمان میں مغربی فلاسفہ کے افکار سے مطمئن نہ تھے۔ جب علامہ انورشاہ نے حدوث عالم کے مسئلہ پر منظوم رسالہ "ضرب الخاتم علی حدوث العالم" لکھا تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر اقبال کو بھی ارسال کیا تھا۔ اگرچہ یہ ایک چند ورقی منظوم رسالہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے عالم و فاضل کے لئے یہ کتابچہ خوانِ جواہر سے کسی طور کم نہ تھا۔ شاہ صاحب نے اس رسالے میں حدوث عالم پر ایسے دلائل و براہین پیش کئے ہیں کہ یہ ادق مسئلہ پانی ہوگیا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سید سلیمان ندوی مرحوم کو اس رسالے کے بارے میں لکھا کہ مسئلہ حدوث پر حضرت شاہ صاحب کی کتاب نے میرے ذہن و فکر کی گرہیں کھول دی ہیں۔

حضرت علامہ انورشاہ صاحب کے نامور شاگرد مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی رقمطراز ہیں:

"ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میں تو مولانا انورشاہ صاحب

کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ (حیات انور مضمون مولانا سعید اکبرآبادی)

مولانا اکبرآبادی رقمطراز ہیں کہ انہوں (ڈاکٹر اقبالؒ) نے چند اشعار کی تشریح مولانا انور شاہ صاحب سے کرائی۔ انور شاہ صاحب نے فارسی مکتوب ان کے ہاتھ ہی ڈاکٹر صاحب کو لکھا۔ مسئلہ زمان پر ڈاکٹر صاحب کو سید انور شاہ صاحب نے ایک مخطوطہ دیا تھا۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے عراقی کی طرف منسوب کیا ہے۔

۱۹۲۸ء میں اورینٹل کانفرنس لاہور کے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال نے خطبۂ صدارت دیا جس میں انہوں نے کہا:

"مشہور حدیث لاتسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ میں دھر بمعنی TIME کا جو لفظ آیا ہے، اس کے متعلق مولوی سید انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں۔ میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی ——
یہ معاملہ مشکوک ہے کہ اس کتابچے کا مصنف کون ہے؟ حاجی خلیفہ نے اسے شیخ محمود کسی بزرگ کی تصنیف بتایا ہے۔ لیکن اس کا سراغ مجھ کو اسلام کے علم اسماء الرجال کی فہرست میں نہیں ملا۔ (انوار اقبال ص ۲۴۸)

ڈاکٹر مرحوم کی نظر میں انور شاہ صاحب کو جو مقام حاصل تھا وہ خط کشیدہ جملوں سے عیاں ہے۔ علامہ نے جس خط و کتابت کا حوالہ دیا ہے، افسوس! اس خط و کتابت کا کوئی حصہ محفوظ نہیں ہے۔ مولانا ادریس سکروڈوی مرحوم جو انور شاہ صاحب کے خادم خاص تھے۔ کہتے تھے کہ "دس بارہ خطوط ڈاکٹر صاحب کے اور حضرت شاہ صاحب کی طرف سے ان کے جوابات کی نقل ان کے پاس محفوظ تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں دہلی میں ضائع ہو گئی۔ (مکتوب سید انور شاہ قیصر بنام مدیر الحق ص ۱)

متذکرۃ الصدر مخطوطے نے اقبال مرحوم کو تحقیق و تفحص کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا تھا۔

چنانچہ حضرت انور شاہ صاحب کی وفات (۲۹ رمئی ۱۹۳۳ء) کے بعد ۸ راگست ۱۹۳۳ء کے خط میں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی (م ۱۳۵۶ھ) کو لکھتے ہیں :

"حضرات صوفیاء میں سے اگر کسی بزرگ نے حقیقت زماں پر بحث کی ہے تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا۔ اس کا نام "درایۃ الزمان" ہے۔ جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ میں نے یہ رسالہ دیکھا ہے۔ چونکہ بہت مختصر ہے۔ اس لئے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔" (اقبال نامہ حصہ اول ص۵۵)

علامہ اقبال شیخ ابن عربی (م) کے خیالات مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے اور پیر صاحب موصوف کے ہاں باقاعدہ فصوص الحکم کا درس ہوتا تھا۔ اسی سلسلۂ بیان میں انہوں نے مولانا سید انور شاہ صاحب کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی ایک خواہش علامہ اقبال شاہ صاحب کے وجود کو اس قدر قیمتی خیال کرتے تھے کہ چاہتے تھے کہ شاہ صاحب مستقل طور پر لاہور آجائیں۔ بدنام زمانہ رولٹ بل (۱۹۱۹ء) کے بعد لاہور کی سیاسی فضا متلاطم رہنے لگی۔ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دیا جاتا تھا۔ اور سیاسی جلسے مسجد میں ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے شاہی مسجد بند کر دی تھی۔ مسجد کی مسند خطابت خالی ہوگئی تھی۔ اور انجمن اسلامیہ کے سامنے یہ مسئلہ تھا۔ علامہ اقبالؒ کے ذہن میں موزوں ترین آدمی انور شاہ صاحب ہی تھے۔

۱۹۲۶ء میں مدرسۃ العلوم دیوبند کے اندرونی حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی جنکی بدولت علامہ انورؒ شاہ صاحب نے دار العلوم سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مولانا عبد الحنان ہزاروی مرحوم جو ان دنوں آسٹریلیا مسجد لاہور میں خطیب تھے انہیں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے دیوبند اس مقصد کے لئے بھیجا کہ وہ شاہ صاحب کو لاہور آنے کے لئے آمادہ کریں۔ لیکن ان سے پہلے گجرات کاٹھیاواڑ کے مخیر حضرات نے ڈابھیل میں ایک دار العلوم قائم کر کے شاہ صاحب کو وہاں بلالیا۔ اور یوں ڈاکٹر صاحب کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب نے انجمن اسلامیہ کی حمایت اسلام دونوں سے معاملہ فہمی کر لی تھی کہ شاہ صاحب اسلامیہ کالج میں علوم اسلامیہ کے سربراہ اور شاہی مسجد کے خطیب ہوں گے مگر کلک قدرت کچھ اور ہی تحریر کر رہا تھا۔

اگر شاہ صاحب لاہور تشریف لے آتے تو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دیرینہ خواہش "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" کسی قدر پوری ہو جاتی۔

ڈاکٹر اقبال اور قادیانیت حضرت شاہ صاحب کی زندگی کا ایک مقصد مرزا غلام احمد قادیانی کے باطل خیالات اور اس کے اکاذیب کو عوام پر عیاں کرنا تھا۔ نیز علمی سطح پر قادیانی گروہ نے جو وسوسے اور شبہات پیدا کئے ہیں ان کا جائزہ لینا تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب نے نزول مسیحؑ اور ختم نبوت پر چند جامع اور مختصر کتابیں رقم کیں۔ جو اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ڈاکٹر مرحوم بھی قادیانیت کے بارے میں ایک عرصہ سے اٹھتے ہوئے ہنگامے دیکھ رہے تھے اور ان کی تہہ میں کار فرما عوامل پر غور کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی گہرے غور و فکر کا نتیجہ ۳ر مئی ۱۹۳۵ء کے اس طویل بیان میں سامنے آیا جو زمیندار اور احسان میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے علامہ انور شاہ صاحب سے قادیانیت کے بارے میں استفادہ کیا تھا۔ اور ان کا یہ بیان شاہ صاحب کے افکار کو نہایت اعلیٰ صورت میں پیش کرتا ہے۔

شاہ صاحب کی وفات ۲۹ر مئی ۱۹۳۳ء کو شاہ صاحب کا انتقال ہوا تو اہل لاہور نے برکت علی اسلامیہ ہال میں تعزیتی جلسہ منعقد کیا جس میں ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی اور اختتام اپنے اس مشہور شعر پر کیا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر "تریاق" لاہور اور "مساوات" امرتسر میں شائع ہوئی تھی۔

محترمہ فہیم عثمانی ایم اے، عربی و ایم اے علوم اسلامیہ

اسلام میں شخصی ملکیت

سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ہی افراط و تفریط پر ہیں۔ نہ شخصی ملکیت کو سرمایہ داری کی طرح بالکل ہی آزاد اور خود مختار چھوڑ دینا مفید اور نہ اشتراکیت کیطرح اسے بالکل ہی باطل قرار دینا مناسب۔ اعتدال کی راہ اسلام ہی کی راہ ہے کہ افراد کو حقوق ملکیت تو حاصل ہوں مگر ایسی حدود اور قیود کے ساتھ جو آزاد ملکیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام خرابیوں کا سدباب کر سکیں۔

اسلام میں شخصی ملکیت کا تصوّر اس قدر بنیادی حیثیت کا حامل ہے کہ معاملات سے متعلق تمام تر اسلامی احکام کا دار و مدار اسی پر ہے اور محض معاملات ہی نہیں اخلاق و عبادات کے مکمل ڈھانچہ کا انحصار بھی کسی نہ کسی صورت میں اسی تصوّر پر مبنی ہے جس طرح بیع شرا، ہبہ، اجارہ اور وراثت و تملیک وغیرہ کے اسلامی قوانین بلا واسطہ طور پر شخصی ملکیت کیساتھ مربوط ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ، صدقۂ فطر، نفل صدقات و خیرات وغیرہ کے احکام بھی شخصی ملکیّت کے جواز و عدم جواز سے بلا واسطہ منسلک ہیں مگر اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ پہلے ہی مرحلہ پر ہو جانا ضروری ہے وہ یہ کہ اسلام نے شخصی ملکیت کا جو تصوّر دیا ہے وہ اس تصوّر سے بنیادی طور پر مختلف ہے جو سرمایہ دارانہ نظام پیش کرتا ہے۔ سرمایہ داری کی نظر میں انسان کو اپنے مال پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے وہ اس کو جس طرح چاہے اپنے تصرف میں لا سکتا ہے مگر اسلام کہتا ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اسی کی ملکیت ہے۔ اللہ تعالیٰ جسکو عطا کر دے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے وہ انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کرتا ہے، مگر اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنا کر گویا انسان کو دولت پر ملکیت تو حاصل ہے مگر آزاد اور خود مختار نہیں بلکہ اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود

انسان کی اس ملکیت پر عائد ہیں، شخصی ملکیت کے سلسلہ میں بھی وہ بنیادی فرق ہے جو اسلام اور سرمایہ داری کے لئے دو جدا جدا راہیں متعین کرتا ہے اور اسی بنیادی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے نتیجے میں بعض کوتاہ بین حضرات نے شخصی ملکیت کے تصور ہی کو بالکلیہ عیب جانتے ہوئے اسلام کے دامن کو اس سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے اور اسلام کے پیش کردہ نظریۂ ملکیت کو تاویلاتِ فاسدہ کے سہارے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔

اس امر میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام نے انسان کیلئے جو ضابطۂ حیات متعین کیا ہے۔ اس میں انسان کی انفرادی و شخصی ملکیت کو اس حد تک نمایاں جگہ دی ہے کہ اکثر انسانی اعمال کا مدار اسی کو ٹھہرایا ہے اور اسی وجہ سے اسکو جا بجا بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات بصراحت افراد کیلئے ملکیت کا حق تسلیم کرتی ہیں۔ اور واضح الفاظ میں افراد کو اپنی ملکیت پر پورا پورا تصرف کرنے کا حق عطا کرتی ہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات کے ذریعہ شخصی ملکیت کے تصور کو پوری طرح واضح فرما دیا ہے۔

اس ضمن میں قرآن وسنت سے شواہد پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حق ملکیت کی صحیح تعریف متعین کر لی جائے۔ مشہور مغربی محقق جان آسٹن نے ملکیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

"اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے یہ کسی متعین شے پر ایک حق کی نشاندہی کرتی ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف وانتقال کے اعتبار سے بے قید ہے۔"

اس کے مقابلہ میں شریعتِ اسلامی کی نظر میں حق ملکیت کی جو تعریف ہے وہ مشہور حنفی محقق علامہ ابن نجیم کے الفاظ میں ابن ہمام نے فتح القدیر میں یوں بیان کی ہے۔

الملك قدرة يثبتها الشارع ابتداء على التصرف الا لمانع ملکیت تصرف کر سکنے کا اختیار ہے جس کا منبع شارع کا اذن ہے الّا یہ کہ کوئی مانع ہو۔

ان دونوں تعریفوں کے درمیان اس فرق کے علاوہ کہ آسٹن کی تعریف ملکیت تصرف و انتقال کے حق کو بے قید اور غیر محدود ٹھہراتی ہے اور اسلام میں اس حق کا انحصار مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ کے اذن پر موقوف ہے۔ یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ کسی چیز پر کسی کی ملکیت اسی وقت ثابت ہوتی ہے، جب اسے اس چیز میں تصرف و انتقال کا اختیار حاصل ہو۔ ملکیت کی تعریف کے اس تعین کے بعد دیکھیئے کہ قرآن وسنت سے یہ حق افراد کے لئے ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے: لاتأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم (النساء: ۲۹) ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تمہارے درمیان تجارت ہو آپس کی رضامندی سے۔

اس آیت شریفہ میں جہاں اموالکم کے الفاظ شخصی ملکیت کا اثبات واضح الفاظ میں کر رہے ہیں، وہاں آپس کی رضامندی سے تجارت کا اختیار دیکر اُن اموال میں افراد کیلئے تصرف کا حق بھی اس آیت نے ثابت کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ پر قرض کے معاملہ کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے:

اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ (البقرۃ ۲۸۲) جب آپس میں کسی مقررہ مدت کیلئے قرض کا معاملہ کرو تو اسکی دستاویز لکھ لو۔

ظاہر ہے کہ قرض کا معاملہ افراد آپس میں اسی صورت میں کر سکیں گے جبکہ انہیں اپنے اموال پر تصرف کا حق حاصل ہوگا۔ یہاں دَین کا باب تفاعل سے لانا اس بات کا ثبوت بھی فراہم کر رہا ہے کہ یہ معاملہ افراد کے درمیان ہوگا۔ حکومت اور عوام کے درمیان نہیں۔ چند آیات کے بعد اسی مقام پر اسکی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے: وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھٰن مقبوضۃ۔ (البقرۃ ۲۸۳) اگر تم سفر میں ہو اور (قرض کی دستاویز لکھنے کیلئے) کاتب نہ ہو تو رہن بالقبض رکھو۔

یہ اندازِ بیان اور سفر کے دوران قرض دینے دلانے کا ذکر بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے کہ یہ معاملہ افراد کے درمیان ہے اور اس وقت تک ناممکن ہے جب تک قرض دینے والے کو اپنے مال میں تصرف کا حق حاصل نہ ہو۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں قرآن کریم سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایک مقام پر محرمات کا ذکر کرنے کے بعد قرآن حکیم کہتا ہے:

واحل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسٰفحین۔ (النساء: ۲۴)	اور ان (حرام عورتوں) کے سوا (باقی عورتوں کے معاملہ میں) یہ بات تمہارے لئے حلال کر دی گئی کہ تم انہیں اموال کے بدلے حاصل کرو نکاح کرنے والے بن کر نہ کہ ناجائز تعلقات رکھنے والے بن کر۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہے:

وآتوا النساء صدقٰتھن نحلۃ (النساء: ۴)	اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو۔

ایک اور مقام پر ہے :

وآتیتم احداھن قنطارًا فلاتاخذ وا منہ شیئاً۔ (النساء)۔	اگر تم نے کسی عورت کو (نکاح کے وقت) ڈھیر سامان بھی دیا ہو تو (طلاق دیتے وقت) اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

غرض یہ تمام امور یعنی اموال کے بدلے نکاح کا عمل میں آنا، عورت کو مہر کی ادائیگی یا ڈھیر سامان بطور بخشش عطا کر دینا یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کو اموال میں تصرف کا حق حاصل ہو۔ اسی حق کی مزید وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں ایسے صریح الفاظ میں فرمائی ہے کہ کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ ارشاد ہے :

کل ذی مال احق بمالہ یصنع بہ ماشاء (کنز العمال جلد ۳ صـ۲۲۴ روایت نمبر ۳۴۸۳)	ہر صاحب مال اپنے مال کا زیادہ حقدار ہے وہ اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔

...

ذرا غور فرمائیے افراد کو اپنے اموال میں تصرف کا حق دینے میں یصنع بہ ماشاء کے الفاظ کس قدر صریح ہیں۔

ان تمام آیات واحادیث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن وسنت کی نظر میں افراد کو اپنے اموال میں تصرف کرنے کا حق حاصل ہے اور اس طرح ملکیت کی اس تعریف کی رو سے جو ہم اوپر متعین کر آئے ہیں افراد کیلئے پچاس فیصد حق ملکیت قرآن وسنت سے ثابت ہوگیا۔ اب رہا انتقال ملکیت کے اختیار کا ثبوت افراد کے حق میں، تو اس کے روشن شواہد سے تو قرآن وحدیث کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ بیع وشرا کے جتنے قوانین ہیں، اجارہ وتملیک کے جتنے احکام ہیں اور ہبہ ووقف وغیرہ کے جتنے مسائل ہیں وہ سب افراد کے حق میں انتقال ملکیت کے اختیار کا ثبوت ہی کو فراہم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ آیات واحادیث جن میں مالک کی رضامندی کے بغیر اسکی چیز پر کسی شخص کے قبضہ کر لینے یا اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے کو باطل ٹھہرایا گیا ہے وہ بھی فی الحقیقت بالواسطہ طور پر افراد کے لئے انتقال ملکیت کا حق ہی ثابت کرتی ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں ہے :

یاایھا الذین آمنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم (النساء ۲۹)	اے ایمان والو ایک دوسرے کے مال آپس میں ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن (جائز طور پر) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو۔

یہ آیت باہمی رضامندی کے بغیر مال کھانے کو حرام ٹھہرا رہی ہے تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے تو اپنے مال کی ملکیت کسی دوسرے کیطرف منتقل کرنے کا پورا حق رکھتا ہے، مگر اسکی رضامندی کے بغیر کوئی دوسرا شخص اسکی ملکیت میں کسی قسم کے تصرف کا کوئی حق نہیں رکھتا۔
اسی بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان فرمایا :

كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه۔ ...

ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کیلئے قابلِ احترام ہے (اور اس پر دست درازی ممنوع ہے) اس کا خون اس کا مال اسکی آبرو۔

شریعت اسلامیہ نے تو اس انتقال ملکیت کے حق کا اس درجہ تحفظ کیا ہے کہ ایسے وقت میں بھی اس حق کو باقی رکھا ہے۔ جب کوئی شخص دشمن کے ہاتھ میں قید ہو اور بے بس ہو۔

اجز وصية الاسير وعتاقه وما صنع فى ماله مالم يتغير عن دينه فانما هو ماله يصنع فيه ما شاء (بخاری شریف جلد ۱)

جو شخص دشمن کے ہاتھ میں قید ہو اسکی وصیت عتاق اور اپنے مال میں تصرف کو جائز قرار دو جب تک وہ دین سے نہ پھرے کیونکہ مال اس کا اپنا ہے وہ اس میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

غرض تصرف کے حق کی طرح انتقال ملکیت کا حق بھی دلائل قطعیہ و براہین شرعیہ سے ثابت ہے اور افراد کے حق میں ملکیت اموال کے ثبوت کیلئے انہی دو باتوں کا ثبوت درکار تھا۔ افراد اگر اپنے اموال میں قرآن و سنت کی رو سے تصرف کا حق بھی رکھتے ہیں اور انتقال ملکیت کا اختیار بھی انہیں حاصل ہے تو بالکلیہ ملکیت اموال کے اثبات میں کیا اشکال باقی رہ گیا۔ اس کے علاوہ قرآن و سنت میں ایسے شواہد بھی بیشمار ہیں جن میں مختلف قسم کے اموال کی بلاواسطہ نسبت افراد کی طرف کی گئی ہے اور جو اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ افراد کو املاک رکھنے اور ان پر تصرف کرنے کے تمام حقوق حاصل ہیں۔ مثال کے طور پر چند آیات و احادیث ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ربانی ہے۔

اولم يروا انا خلقنا لهم مما عملت ايدينا انعاما فهم لها مالكون (یٰسین : ۷۱) ...

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا پھر بھی لوگ ان کے مالک ہیں۔

وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم۔ (نور: ۳۳)	اور ان کو اللہ کے مال میں سے کچھ دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جہاں یہ صراحت کردی گئی کہ تمام چیزوں کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے وہیں انسان کی شخصی ملکیّت کو بھی واضح طور پر قائم کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے متعدد مقامات پر زمین، باغ، گھر، زمین کی پیداوار، نقد سرمایہ اور دیگر اشیاء کی ملکیت افراد کی طرف منسوب کرکے یہ تبلادیا کہ افراد کو ہر قسم کے اموال اپنی ملکیّت میں رکھنے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً زمین کے بارے میں ارشاد ہے:

واورثکم ارضھم ودیارھم و اموالھم وارضاً لم تطئوھا۔	اس نے تم کو انکی زمین ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنادیا۔ اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔

اسی طرح باغ کی نسبت کرتے ہوئے فرمایا:

واضرب لھم مثلاً رجلین جعلنا لاحدھما جنتین من اعناب و حففنٰھما بنخل وجعلنا بینھما زرعا۔ (کہف: ۳۲)	ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو دو شخص تھے ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔
یا ایھا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوتاً غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علیٰ اھلھا۔ (النور: ۲۷)	اے ایمان والو اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوتا وقتیکہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔

زمینی پیداوار کی ملکیت کو یوں واضح کیا:

انفقوا من طیبٰت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض۔ (البقرہ: ۲۶۷)	اپنی پاکیزہ کمائی میں اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو۔

نقد سرمایہ کی ملکیت کو بھی اسی طرح صراحت سے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وان تبتم فلکم رؤس اموالکم (البقرہ: ۲۷۹)	اور اگر تم (سود خواری سے) توبہ کر لو تو تم اپنے اصل سرمایہ کے حقدار ہو۔

ان تمام آیات میں مختلف قسم کے اموال کی ملکیت افراد کی طرف منسوب کر کے دراصل یہی بتلایا گیا ہے کہ افراد کو ہر قسم کے اموال میں ملکیت کا حق حاصل ہے ، ان آیات قرآنی کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال بھی ملاحظہ فرمائیے ۔ ارشاد ہے :

الالا تظلموا الالا یحل مال امرئٍ الا بطیب نفسٍ منہٗ ۔ خبردار ظلم نہ کرو خبردار کسی شخص کا مال حلال نہیں مگر مال والے کی خوشی کے ساتھ ۔

(مشکوٰۃ شریف باب الغصب) ...

ایک اور موقعہ پر فرمایا ؛

من قتل دون مالہٖ فھو شھید ۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے ۔

(بخاری ابواب المظالم والقصاص)

یہ احادیث بھی شخصی ملکیت کے اثبات میں بڑی واضح ہیں ۔ اختصار پیش نظر ہے ورنہ قرآن وسنت سے اس سلسلہ میں لاتعداد شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ پھر ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ انفرادی طور پر ہر قسم کی املاک اپنے پاس رکھتے تھے اور شریعت حقہ کی حدود میں رہتے ہوئے ان پر تمام تصرفات عمل میں لاتے تھے ۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر طرح کی املاک رکھتے اور ان کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے تھے آپکے زمانہ میں یہ رواج عام تھا کہ کوئی شخص اپنا نقد سرمایہ محفوظ رکھتا تو کوئی اپنی مرضی سے اسے کسی کاروبار میں لگا دیتا ۔ قرض دینے یا نفع میں شرکت کے اصول پر کاروبار کرنے کی رسم بھی عام تھی ، ذاتی استعمال کیلئے لوگ سواری کے جانور بھی پالتے تھے ۔ رہائش کیلئے مکانات بھی اپنی ملکیت میں رکھتے تھے ۔ زمینوں باغوں اور کھیتوں کے مالک بھی موجود تھے ۔ ان تمام املاک کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی ۔ اور مالک کے مرنے پر اس کے ورثاء کے درمیان ان کی تقسیم بھی ہوتی تھی ۔ یہ تمام امور اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں انفرادی ملکیت کا رواج عام تھا ۔ اس پر آپ نے کبھی نکیر نہیں فرمائی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک فرمان بھی ایسا نہیں ملتا جو صراحتاً انفرادی ملکیت کی نفی کرتا ہو اس کے مقابلہ میں ایسے ارشادات بیشمار ہیں جو انفرادی ملکیت کو سند جواز عطا کرتے ہیں ۔ اگر بالفرض والمحال قرآن وسنت میں انفرادی ملکیت کے جواز و تسلیم کا مثبت اعلان نہ بھی ملتا تو شریعت کے عام اصول کے مطابق یہی خیال کیا جاتا کہ اسلام انفرادی ملکیت کے اس رواج پر خاموشی اختیار کر کے اسے سند جواز عطا کر رہا

ہے۔ لیکن یہاں تو امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس حق کی تائید کرتے ہیں۔

قرآن و سنت کی ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کی طرف انفرادی ملکیت کے ابطال کی نسبت کی جائے مگر حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو اپنا سارا زور اس پر صرف کرتے نظر آتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلام نے انفرادی و شخصی ملکیت کا کوئی تصور دیا ہی نہیں۔ دراصل یہ لوگ اشتراکیت سے مرعوب ہیں اور اسی مرعوبیت کے نتیجہ میں وہ اشتراکی نظریات کو قرآنی آیات و احادیث نبویہ میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کوشش میں انہیں آیات و احادیث میں تاویلات فاسدہ ہی سے کام کیوں نہ لینا پڑے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ یہ لوگ نظریۂ ملکیت کی بنا تو رکھتے ہیں ملکیت کے اس تصور پر جو سرمایہ داری نے پیش کیا ہے اور پھر کتاب و سنت کی رو سے اس کا باطل ہونا ثابت کر کے انکار اس تصور ملکیت کا بھی کر بیٹھتے ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔ غیر محدود اختیارات کا حامل وہ نظریۂ ملکیت تو یقیناً اسلام کے نزدیک بھی باطل ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا طرۂ امتیاز ہے اور جس کے بُرے نتائج نے معیشت انسانی کو فساد کا شکار بنا رکھا ہے مگر ملکیت کا وہ تصور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ چند حدود و قیود کا پابند ہے اسلام نے اسکی واضح صورت ہی متعین نہیں کی اسکی عملی شکلیں بھی متعین کر دی ہیں اور وہی نظریۂ ملکیت دراصل اس قابل ہے کہ انسانی معیشت کی اصلاح کا ضامن بن سکے۔ جیسا کہ میں ابتداء میں ذکر کر آیا ہوں۔ اس کائنات کی ہر چیز کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مگر وہ اپنی طرف سے انسانوں میں سے جسکو جس چیز کا مالک بنا دے اسکو بھی ملکیت کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔ گو یہ حقوق اللہ کی اذن کے پابند ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اسی معنیٰ میں ملکیت کی نسبت کو جو قرآن و حدیث میں جا بجا بیان ہوئی ہے اشتراکی حضرات نے اپنی اغراض کے حصول کے لئے سب سے بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ایک عام آدمی کو دھوکہ میں مبتلا کرنے کیلئے ان کا طرز استدلال کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ اسلام میں ملکیت کی نسبت خدا کی طرف کی گئی ہے۔ اب کسی چیز میں خدا خود ظاہر ہو کر تو تصرف نہیں کرتا اس کے تصرف کی یہی شکل ہے کہ اس کی جانب سے حکومت اسلامیہ یا خلافت شرعیہ اسکی مالک بنے۔ حالانکہ ان کی یہی دلیل خود ان کے خلاف جاتی ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر جس دلیل سے

وہ اللہ تعالیٰ کیطرف سے اشیاء میں تصرف کا حق حکومت کے چند عہدیداروں کو عطا کرتے ہیں اسی دلیل سے افرادِ معاشرہ کیطرف وہ حق کیوں منتقل نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ تو کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے، پھر یہ اشیائے صرف اور غیر صرف کی تفریق کیسی۔ کیا اشیائے صرف کی ملکیت اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت نہیں۔

مزید برآں اس پر بھی ذرا غور کیجیئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کائنات کی دیگر تمام اشیاء کا مالک حقیقی ہے اسی طرح انسان بھی خواہ مرد ہو خواہ عورت اسکی مخلوق اور اسکے مملوکہ ہیں، پس اگر خدا کی طرف ملکیت کی نسبت کی بنیاد پر کائنات کی دیگر اشیاء کی انفرادی ملکیت کی نفی پر استدلال درست ہے تو آوارہ منش لوگ اگر یہی طرزِ استدلال عورت کی ملکیت کیلئے استعمال کرنے لگیں اور عورت کو بھی تمام قوم کی ملکیت ماننے پر اصرار کرنے لگیں تو آپ کے پاس ان کے اس اخلاقی فساد کا کیا جواب ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اشتراکی حضرات کو اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت ہی کیوں نظر آتی ہے۔ دوسری تمام صفات علم سمع بصر ارادہ اور کلام وغیرہ بھی تو فی الحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ثابت ہیں اور ان کی نسبت بھی جا بجا قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف کی گئی ہے۔ پھر اس بات کی کیا توجیہہ ان کے پاس ہے کہ وہ انسان کو جاننے والا، سننے والا، دیکھنے والا، ارادہ کرنے والا اور بولنے والا تو کہہ سکتے ہیں مگر مالک نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح یہ بات بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ان اشتراکی حضرات کو قرآن پاک میں ان الارض للہ کے الفاظ تو نظر آتے ہیں جنکی غلط تاویلات میں یہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں مگر ان کی نظر قرآن پاک ہی کی آیت ان الحکم الا للہ پر نہیں پڑتی۔ یہ کیا دورنگی ہے کہ معیشت کے میدان میں تو قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا دعوٰی ہے، مگر حکومت وسیاست کے معاملہ میں قرآنی دستور کی کوئی پرواہ نہیں۔ ان الحکم الا للہِ میں تو حصر اور تاکید بھی ان الارض للہ کے مقابلہ میں زیادہ ہے، ذرا خدائی قانون بھی تو نافذ کرکے دکھائیے۔ مالکیت کی طرح حاکمیت بھی تو صرف اللہ ہی کے لئے خاص ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ معیشت کا ذکر ہو تو آپ کو قرآنی آیات میں دور از کار تاویلات سے بھی گریز نہیں اور خدائی قانون کے نفاذ کی بات آئے تو آپ بغلیں جھانکتے نظر آئیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ ان الارض للہ کے الفاظ سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ملکیت تمام تر اللہ ہی کیلئے ہے وہ اس آیت کے فوراً بعد آنیوالے الفاظ کیوں حذف کر جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے بعد اللہ تعالیٰ یہ بھی تو فرما رہا ہے کہ یورثہا من یشاء من عبادہ۔ اللہ تعالےٰ

اپنے بندوں میں سے جسکو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے، کیا اس آیت سے انفرادی ملکیت کا وہی تصور سامنے نہیں آتا جو ہم ابتدا میں ثابت کر آئے ہیں کہ مالک حقیقی تو ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اپنے بندوں کو بھی اس نے ملکیت کے حقوق چند حدود و قیود کے ساتھ عطا کر دئے ہوئے ہیں۔ اور ملکیت کا فی الحقیقت یہی وہ تصور ہے جو انسانی معیشت کے مزاج کو درست رکھنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ہی افراط و تفریط پر ہیں نہ شخصی ملکیت کو سرمایہ داری کی طرح بالکل ہی آزاد اور خود مختار چھوڑ دینا مفید اور نہ اشتراکیت کی طرح اسے بالکل ہی باطل قرار دینا مناسب۔ اعتدال کی راہ اسلام ہی کی راہ ہے کہ افراد کو حقوق ملکیت تو حاصل ہوں مگر ایسی حدود اور قیود کے ساتھ جو آزاد ملکیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تمام خرابیوں کا سدباب کر سکیں۔

از شیخ التفسیر مولانا احمد علی[۱] لاہوری قدس سرہ العزیز

مخدومی ومحترمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دو والانامے بندہ کے نام اور عزیز القدر مولوی محمد انور[۲] سلمہ' کے نام وصول ہوئے تقریباً سب میں ایک ہی ارشاد تھا کہ ۲۶-۲۷ مئی ۱۹۵۰ء کے جلسہ میں حاضر خدمت ہو جاؤں۔ عرض یہ ہے کہ انشاءاللہ ۱۲ مئی ۱۹۵۰ء کی شام کو حیدرآباد، سندھ اور کراچی کے سفر پر بسلسلۂ تبلیغ جارہا ہوں۔ انشاءاللہ ۲۵ مئی تک واپس آؤں گا، اور ۲۶ کو جمعہ ہے۔ اس لئے اتنے طویل سفر سے واپس آنے کے بعد فوراً خدمت اقدس میں روانگی مشکل ہے۔ اگر ایک دو ماہ پہلے حکمنامہ پہنچ جاتا تو صوبہ سندھ کا سفر ملتوی کر دیتا اور جناب والا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ عزیز القدر مولوی محمد انور سلمہ' سے مؤدبانہ سلام مسنون معروض ہو۔

۷ مئی ۱۹۵۰ء

مخدومی ومکرمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کی مجوزہ تاریخیں میں نے ڈائری میں نوٹ کر لی ہیں۔ فقط۔ ۴ فروری ۱۹۵۳ء۔

مخدومی ومکرمی مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تقریباً ایک ماہ سے بائیں جانب کچھ فالج کا اثر ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے اسی تکلیف کے باعث سفر ملتوی کر دیا ہوا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ شفاء کامل اور عاجل عطا فرمائے تو مجھے آپ کے حکم کی تعمیل میں کوئی انکار نہیں ہے۔[۳]

۲ مارچ ۱۹۵۵ء

---

[۱] مفسر قرآن، مجاہد جلیل، استاد العلماء، عارف باللہ، مرشد کامل، سیدی واستاذی مولانا احمد علی لاہوری۔ المتوفی ۱۹۶۱ء

[۲] مولانا عبیداللہ انور صاحب جانشین وصاحبزادہ حضرت شیخ التفسیر مرحوم۔

[۳] دارالعلوم حقانیہ کے جلسۂ دستاربندی منعقدہ ۹-۱۰ شعبان ۱۳۷۴ھ میں دعوت شمولیت کے جواب میں۔

مخدومی و محترمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'
عرض یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کے فضل سے مجھے خود دین کی خدمت کا شوق ہے۔ تقریباً دو ماہ سے بدن کے بائیں حصہ پر فالج کا خفیف سا اثر ہے اور معمولی ہوا بھی برداشت نہیں ہو سکتی اسلئے میں نے سب سفر ملتوی کر دئیے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفاء کامل اور عاجل عطا فرمائے۔ اگر یہ عذر نہ ہوتا تو یقیناً آپ کے ارشاد کی تعمیل کرتا۔ مگر اب مجبور ہوں ــــ ۱۹ر مارچ ۱۹۵۵ء ــــ

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ
والا نامہ نے سرفراز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرما دے، اور خاتمہ ایمان کامل پر ہو۔　　　ــــ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۵ء ــــ

محترم المقام مخدومی حضرت مولانا عبدالحق صاحب ۔ السلام علیکم
انجمن خدام الدین کی طرف سے ہفتہ وار رسالہ " خدام الدین " عرصہ ۲½ ماہ سے شائع ہو رہا ہے شاید اسکی اطلاع آپ کو ہو چکی ہوگی۔ تاہم آخری شمارہ کا ایک پرچہ بطور نمونہ بھیجا جا رہا ہے جو امید ہے کہ اس خط کے ساتھ ہی آپ کو مل جائے گا۔ اس کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ہمارا مسلک خالصتاً تبلیغ دین ہے۔ اور اسکی اشاعت کا قطعاً کوئی سیاسی یا مجلسی مدعا نہیں۔ الحمد للہ تا حال پرچہ بخوبی چل رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ آپ بھی اس تبلیغ میں حصہ لیں۔ اسکی صورت یہ ہے کہ ہر جمعرات کو پندرہ بیس پرچے آپ کو بھیج دئیے جائیں۔ آپ جمعہ میں ان کا اعلان کر دیں۔ کہ اس پرچہ کا مقصد تجارت اور حصولِ زر نہیں بلکہ خدمتِ اسلام ہے۔ اپنے کسی طالب علم کو دروازے پر کھڑا کر دیں جو ان پرچوں کو فروخت کرے۔ اس طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لئے وصول شدہ قیمت میں سے آپ اسکو ایک آنہ فی پرچہ معاوضہ دے دیں۔ جو پرچے باقی بچیں وہ بیشک واپس کر دیں۔ آپ کا جواب آنے پر پرچہ جات روانہ کئے جائیں گے۔ جواب میں پرچوں کی تعداد بھی تحریر فرما دیجئے گا۔ کہ کتنے بھجوا دوں جواب جلدی عنایت فرمائیں۔[۲]　　والسلام　　ــــ ۲۰ر اگست ۱۹۵۵ء ــــ

---

[۱] نیت کے اس خلوص نے خدام الدین کو آگے چل کر کافی عرصہ تک دعوت و تبلیغ کا ایک شجرۂ طوبیٰ بنائے رکھا (س)

[۲] ہفت روزہ خدام الدین کے فروغ و اشاعت کے سلسلہ میں غالباً یہ والا نامہ بہت سے حضرات کو بھیجا گیا تھا (س)

مخدومی و مکرمی استاد العلماء حضرت مولانا عبد الحق صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس چٹھی کے ہمراہ ایک مسودہ[1] ارسال خدمت ہے۔ مہربانی کر کے اپنے ہاں کے علماء کے دستخط کروا کر جتنی جلدی ممکن ہو واپس بھجوا دیں۔ اس سے پیشتر چھیاسٹھ علماء کے دستخط ہو چکے ہیں۔ ——— یکم جنوری ۱۹۵۶ء ———

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا عبد الحق صاحب دامت معالیکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' والانامہ نے سرفراز فرمایا جس میں مجلس شوریٰ دار العلوم حقانیہ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت تھی۔ میرا دل بھی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آپ کی مجوزہ تاریخ پر ضلع شیخوپورہ میں ایک اجلاس میں شرکت کا وعدہ کر چکا ہوں اس لئے تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ گذشتہ رمضان شریف میں آپ کا اپنے دار العلوم کے طلبہ کو دورۂ تفسیر میں بھیجنا اس عاجز پر ایک بہت بڑا احسان[2] تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسکی دارین میں جزائے خیر عطا فرما دے۔ آمین یا الہ العالمین۔ ——— ۱۱ر محرم الحرام ۱۳۷۴ھ ———

مخدومی و مخدوم العلماء حضرت مولانا عبد الحق صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ اپنے دار العلوم کے تمام شعبوں کے اساتذہ کرام اور تعداد طلبہ سے مطلع فرما دیں میں ان اعداد و شمار کو خطبۂ جمعہ[3] میں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ جواب سے جلد ہی مطلع فرمایا جائے گا۔ ——— ۱۴ر رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ ———

---

[1] غالباً وہ مسودہ مراد ہو جو بعد میں حضرت لاہوری ؒ کے قلم سے "مودودیت" سے حق پرست علماء کی ناراضگی کے اسباب کے نام سے شائع ہوا جس پر مکتوب الیہ کے دستخط بھی ثبت ہیں یا شاید اسلامی آئین یا قادیانیت کے سلسلہ میں کسی مطالبہ کا مسودہ تھا۔

[2] اپنے وقت کے شیخ اور ولی کامل ماہر اسرار قرآن استاذ کی خدمت میں پہنچنا خود تلامذہ کی سعادتمندی اور خوش بختی تھی مگر یہ حضرت کے "خلق عظیم" ہی کا جلوہ ہے کہ طلبہ کی شرکت کو احسان سے تعبیر کر رہے ہیں۔ کیا جدید نظام و طرز تعلیم بھی استاد اور شاگرد کے ایسے روابط کی مثال پیش کر سکتا ہے۔

[3] دار العلوم کے احوال و کوائف کا ذکر خیر حضرت لاہوری کے قلم سے نہایت زور دار کلمات تحسین کے ساتھ اس رمضان کے خطبۂ جمعۃ الوداع مطبوعہ خدام الدین ۲۷ر اپریل ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

مخدومی و محترمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ والانامہ نے سرفراز فرمایا آپ کے سالانہ جلسہ کے لئے ۱۷ر شعبان ۱۳۷۶ھ[1] مطابق ۲۰ر مارچ ۱۹۵۷ء بروز چہارشنبہ تجویز کرتا ہوں۔ یہ تاریخ میری خالی ہے اگر منظور ہو تو مطلع فرمادیں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے وجود مسعود کو تادیر سلامت رکھے اور اشاعت دین متین کی توفیق عطا فرمادے۔ اور اس خدمت کو خلق اللہ اور آپ کی نجات کا ذریعہ بنادے۔ آمین یا الٰہ العلمین۔

—— ۲۸ر جنوری ۱۹۵۷ء ——

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کے ارشاد کے مطابق بندہ نے ڈائری میں تاریخیں تبدیل کرلی ہیں مطمئن رہیں۔ فقط

—— ۲ر فروری ۱۹۵۷ء ——

مخدومی و محترمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میں نے آپ کی مجوزہ تاریخ ڈائری میں نوٹ کرلی ہوئی ہے انشاءاللہ تعالیٰ جب جلسہ بروز اتوار بعد از نماز ظہر ہے تو انشاءاللہ تعالیٰ بندہ اتوار کی صبح کو حاضر خدمت ہوگا۔ اگر مجھے آپ اسی دن ۱۷ر مارچ کی شام کو واپس آنے کی اجازت دے سکتے ہیں تو مطلع فرمادیں۔ تاکہ واپسی پر سیکنڈ کلاس کی سیٹ ریزرو کرانے کا انتظام لاہور ہی سے کرکے آؤں۔

—— ۱۴ر فروری ۱۹۵۷ء ——

محترم المقام جناب مہتمم صاحب زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مورخہ ۳ر اکتوبر کو انشاء اللہ تعالیٰ عمرہ کے لئے روانگی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یکم و دو نومبر ۱۹۵۸ء تک واپسی نہیں ہوسکتی، لہٰذا معذوری ہے۔[2]

---

[1] اس اجتماع میں دارالعلوم کی جدید شاندار عمارت کا افتتاح بھی کرایا گیا۔ دارالحدیث میں شیخ لاہوریؒ اور شیخ محمود غشتویؒ کے علاوہ سینکڑوں اکابر علماء کے اجتماع اور پرسوز دعا و الحاح نے ایک عجیب سماں باندھ کر پورے ماحول کو مسحور بنادیا تھا۔ (س)

[2] کارڈ پر ۲ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کی مہر ہے۔

مخدومی و مکرمی حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ کے دلالۃ علی الخیر کی برکت سے آپ کے دارالعلوم[1] سے ایک معتدبہ جماعت دورۂ تفسیر میں شامل ہونے کیلئے لاہور آجاتی ہے ورنہ ہندوستان سے تو طلبہ کی آمد تقریباً بند ہو چکی ہے ۔ آپ کے بعض طلباء کے خطوط میں آپ نے اس عاجز کو بعد از رمضان شریف اپنے جلسہ میں شرکت کیلئے یاد فرمایا ہے ۔ عرض یہ ہے کہ میرا معمول یہ ہے کہ آخر ذی قعدہ تک جب تک اس جماعت کو فارغ کر کے رخصت نہ کر لوں اس وقت تک جلسوں میں شرکت نہیں کرتا تاکہ اس جماعت کا حرج نہ ہو ۔ میں امید کرتا ہوں کہ میری معذرت قبول فرما کر ممنون فرمائیں گے ۔ بارگاہِ الٰہی میں دست بہ دعا ہوں کہ آپ کو تادیر سلامت رکھے اور اشاعتِ دین کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے ۔ آمین یا الہ العالمین

۔۔۔۔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ ۔۔۔۔

مخدومی و مخدوم العلماء حضرت مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ تہنیت نامہ وصول پایا ۔ اللہ تعالیٰ اس ہدیۂ تبریک کی آپ کو جزائے خیر عطا فرما دے ۔ آمین ۔ آپ کے دارالعلوم کو اللہ مرکزِ ہدایت ابدالآباد تک رکھے ۔ آمین ثم آمین

۔۔۔۔ ۱۰ نومبر ۱۹۵۸ء ۔۔۔۔

---

[1] دارالعلوم حقانیہ سے فارغ ہونے والے فضلاء کی ایک معقول جماعت ہر سال ان کے دورۂ تفسیر میں شمولیت کرتی ۔ خط میں اس کا ذکر ہے ۔

نوٹ :۔۔۔ مولانا مرحوم عام عادت سے ہٹ کر سنتِ نبوی کی اتباع میں آخر میں دستخط کی بجائے مضمونِ خط کے آغاز میں "از احقر الانام احمد علی" لکھا کرتے تھے ، یہاں اختصاراً یہ الفاظ خطوط سے کاٹے گئے ہیں ۔

ملفوظات

مولانا عبد الغفور عبّاسی مدنیؒ

امورِ آخرت کی طرف ترغیب | فرمایا : دارتحل الدنیا مدبرۃً وارتحلۃ الاخرۃ مقبلۃ ولکل منھما بنون فکونوا من ابناء الآخرۃ ولا تکونوا من ابناء الدنیا (مشکوٰۃ کتاب الرقاق عن حضرت علیؓ۔) ترجمہ : دنیا نے کوچ کیا اس حال میں کہ پیٹھ دے کر جا رہی ہے۔ اور کوچ کیا آخرت نے اس حال میں کہ وہ سامنے آرہی ہے۔ نیز ان میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں۔ تم آخرت کے بیٹے بنو۔ دنیا کے بیٹے نہ بنو۔

یعنی آخرت کے دوست بنو۔ دنیا کے محب نہ بنو۔ دنیائے دنیہ خسیسہ کے طالب نہ بنو ـــ اس حدیث میں امورِ دنیا سے اعراض اور امورِ آخرت کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے۔ آجکل ہم ایسا دنیا میں پھنس چکے ہیں کہ آخرت کو بھول چکے ہیں۔ ہمیں صرف پیٹ کو بھرنے کا خیال ہے۔ یا سونے کا خیال ہے۔ نہ اپنے نفس کی اصلاح کا خیال ہے۔ اور نہ اپنی اولاد کی اصلاح کا خیال ہے۔ حالانکہ دنیا کی ہر نعمت فانی ہے۔ ہر نعمت کا بدل بھی دنیا میں موجود ہے۔ دولت گئی تو دوسری دولت مل جائے گی۔ بیوی کی جگہ دوسری بیوی مل جائے گی۔ بیٹے کی جگہ دوسرا بیٹا اور مال کی جگہ دوسرا مال مل جائے گا۔ لیکن نعمت ایمان کی ہے اور نعمت اسلام ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

لکل شیءٍ اذا فارقتہٗ خلفٌ
ولیس للّٰہ ان فارقت من خلفٍ
لکل شیءٍ ان فارقتہٗ عوضٌ
ولیس للّٰہ ان فارقت من عوضٍ

ہر چیز کے لئے خلف موجود ہے اور عوض موجود ہے۔ لیکن ایک نعمت ایمان واسلام ہے۔ جس کا کوئی عوض نہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ اس نعمت ایمان کی زیادہ حفاظت کریں۔

جب ہم چند پیسے کا لفافہ جیب میں ڈالتے ہیں تو جیب کے اوپر سوئی بھی لگاتے ہیں۔ اور بار بار دیکھتے ہیں کہ کہیں چور تو نہیں لے گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے وجود میں جو ایمان کی دولت موجود ہے۔ اس کے پیچھے شیاطین اور نفس بڑے چور لگے ہوئے ہیں۔ اس کی ذرا بھر ہم کو فکر نہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہمیں حرص مال اور جاہ نے تباہ کر دیا ہے۔ اسی چیز نے ابوجہل کو نعمت ایمان سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور نبوت کو پوری طرح جانتا تھا ــــ غزوہ بدر میں ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اپنی فوج کی صفیں کھڑی کیں تو امیہ بن خلف نے ابوجہل کے کان میں جا کر کہا کہ اب ہم گھروں سے نکلے ہیں۔ اور ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑیں گے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا نہیں۔ ابوجہل نے جواب دیا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ سچے نبی ہیں۔ لیکن اگر ہم آپ کو سچا مان لیں تو ہماری عزت ختم ہو جائے گی۔ ریاست چلی جائے گی۔ وہ حب دنیا کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے جدا ہوا۔

حُب دنیا اور حرام مال فرمایا: ایک دن بزرگان دین کا حلقہ تھا۔ وہ فرمانے لگے کہ لوگ سب گناہوں سے تو توبہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک گناہ ایسا ہے جس سے کوئی بھی توبہ نہیں کرتا۔ حالانکہ اس میں اکثریت عالم گرفتار ہے۔ پیر فقیر بھی گرفتار ہیں۔ اس سے توبہ کرنی چاہیئے۔ وہ ہے حُب دنیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔ (دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے) ہمارے حضرات اس حدیث شریف کی شرح میں فرماتے ہیں: وترکھا مفتاح کل فضیلۃ۔ (اور دنیا کی محبت کو چھوڑ دینا ہر فضیلت کی کنجی ہے۔)

دنیا میں عزت مال سے ہے اور آخرت میں اعمال سے۔ حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں جب بیت اللہ شریف میں حاضر ہوا تو ایک شخص کو دیکھا کہ بیت اللہ شریف کی چوکھٹ مبارک پکڑ کر دنیا طلب کر رہا تھا۔ مجھے اس کی کم ہمتی پر افسوس ہوا کہ ایسے اعلیٰ ترین دربار میں کھڑے ہو کر محض دنیا مانگ رہا ہے۔

نیز آپ فرماتے ہیں کہ جب میں منیٰ کے بازار میں پہنچا، تو ایک نوجوان تاجر کو دیکھا کہ سامنے گنیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ لیکن جب میں اس کے دل کی طرف متوجہ ہوا تو ایک لحظہ کے لئے بھی اس کے دل کو یاد خدا تعالیٰ سے غافل نہ پایا۔ مجھے اس کی علو ہمتی پر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ بازار

غفلت کا مقام ہے اور جوانی کا زمانہ بھی غفلت کا وقت ہے اور دنیاوی مال و متاع بھی۔ غافل کرنے والی چیزیں ہیں۔ لیکن ان باتوں کے باوجود یہ نوجوان ذرا بھر ذکر الٰہی سے غافل نہیں۔

میں اپنے دل کو ملامت کرنے لگا کہ اے بہاؤ الدین تو بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ کہلاتا ہے۔ مگر حقیقی معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ یہ نوجوان ہے جو اسکی یاد میں مشغول ہے۔ مجھے اس حسرت اور تعجب پر پیشاب کی بجائے خون آنے لگا۔

ہمارے اسلاف یہ تھے مگر ہم دنیا کی محبت اور اسے جمع کرنے کی حرص میں ہر وقت پھنسے رہتے ہیں۔ اور یہ حالت ہمیں خدا تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی ہے۔ کسی بزرگ نے فرمایا ہے۔

فانّ سحر هاروت و ماروت یفرق بین المرء و زوجه۔ وهذه السحارة یفرق بین العبد و ربه۔ یعنی ہاروت اور ماروت کا جادو تو عورت اور مرد میں جدائی کرتا تھا۔ مگر اس دنیا کا جادو بندے اور اس کے رب جل شانہٗ کے درمیان جدائی کرتا ہے۔

یہ بات بھی خوب سمجھ لو کہ میں یہ بات ہرگز نہیں کہتا کہ تم تارک الدنیا ہو جاؤ۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ حلال ذریعہ سے دنیا بھی کماؤ۔ اور دین کی بھی حفاظت کرو۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ دین کو دنیا سے مقدم رکھو۔

ما احسن الدین والدنیا اذا اجتمعا

واقبح الکفر والافلاس بالرجل

کیا ہی اچھا ہے کہ انسان دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی ہو۔ اور کیا ہی بُرا ہے کہ کافر بھی ہو اور مفلس بھی ہو۔ یہاں بھی مفلس اور وہاں بھی مفلس۔

حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لا یؤمن احدکم حتی یکون هواه تبعاً لما جئت به۔ جب تک انسان اپنی تمام خواہشات کو حضور کے فرامین عالیہ کے مطابق اور ان کے تابع نہ رکھے تب تک مؤمن نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزقِ حلال کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حضرت ابن مزنی نے الترغیب والترہیب میں لکھا ہے۔ اگر کپڑا ایسا ہے کہ نو درہم حلال کے اور ایک حرام کا ملا کر خریدا گیا ہے تو یہ کپڑا اوڑھ کر جو عبادت کی جائے گی وہ قبول نہ ہوگی۔

اجتمع الحلال والحرام الاغلب علیه الحرام۔ جب حلال و حرام مل جائے تو کیا تمیز ہو سکتی ہے۔

۔ حرام مال سے حج کرنے والا جب "لبیک" کہتا ہے تو وہاں سے آواز آتی ہے: لا لبیک۔

——— مسلمانوں حرام مال سے بچنے کی کوشش کرو۔

مال حلال ہے تو حساب ہے۔ اگر حرام ہے تو وبال ہے۔ حلالہا حساب وحرامہا وبال۔ انسان کے معدہ کی مثال حوض کی سی ہے، اور باقی اعضاء مثل کھیت کے ہیں۔ تو حوض میں اگر صاف پانی جمع ہوگا وہ کھیتوں میں جائے گا تو فصلیں اور درخت اچھے اگیں گے۔ میوہ اچھا لگے گا۔ جو فائدہ دینے والا ہوگا۔ اس کو دیکھ کر طبیعت بھی خوش ہوگی۔ اور میوہ بھی لذیذ ہوگا۔ اگر حوض کا پانی گندہ اور غلیظ ہے۔ تو وہ کھیت میں جاکر درختوں کو جلا دے گا۔ دیکھنے والے کی طبیعت پریشان ہوگی۔ اور بدمزگی ہوگی۔ نفع دینے والا میوہ پیدا نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر انسان کے معدہ میں کھانے پینے کی چیزیں حلال وجہ سے پیدا کی ہوئی پہنچیں گی تو تمام اعضا میں طاقت آجائے گی جس سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع قولاً زبان سے فعلاً جوارح سے اور حالاً قلب سے نصیب ہوگا۔ اگر معدہ میں حرام ذرائع سے حاصل کردہ روزی پہنچے گی تو انسان برائیوں کی طرف مائل رہے گا۔ اور حرام میں غرق رہے گا۔

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تابعین حضرات میں سے ہیں۔ آپ کی خدمت گرامی میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی علمنی الورع کہ حضرت مجھے ورع (تقویٰ اور پرہیزگاری) سکھلائیے۔ آپ نے فرمایا میں خود اہل ورع نہیں۔ (سبحان اللہ کسر نفسی ان حضرات سے سیکھی جائے۔) اس نے عرض کیا حضرت آپ کے اہل ورع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ آپ کو کیوں اہل ورع نہ مانا جائے۔ آپ نے فرمایا میں نے امراء اور سلاطین کا مال کھایا ہے جو مشکوک ہے۔ تم عراق میں جاؤ وہاں ایک فقیر ملے گا جو ہل چلا رہا ہوگا۔ اسے میرا سلام دینا وہ اہل ورع ہے۔ تقویٰ اس سے سیکھنا۔ وہ شخص تقویٰ اور پرہیزگاری کا بلندترین مقام سیکھنے کی غرض سے عراق گیا۔ اور اس فقیر کو ملا۔ وہ ہل چلا رہا تھا۔ اس نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا سلام عرض کیا۔ اور اس نے اپنا حال سنایا۔ فقیر نے فرمایا کہ حسن بصریؒ سے جاکر کہہ دینا کہ جس وقت آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں برابر صاحب تقویٰ تھا۔ مگر اب مجھ میں وہ تقویٰ نہیں رہا۔ اس شخص نے وجہ دریافت کی تو فقیر نے فرمایا کہ میں ایک دن ہل چلا رہا تھا۔ نماز کا وقت ہوگیا۔ میں ہل چھوڑ کر نماز پڑھنے لگ گیا۔ اسی اثنا میں میرا بیل پڑوسی کی زمین میں گھس گیا۔ اور اسکی زمین کی مٹی اپنے پاؤں سے میری زمین میں لے آیا۔ اب میرا تقویٰ بھی وہ تقویٰ نہیں رہا۔ دیکھئے ہمارے اسلاف کا تقویٰ کس درجہ کا تھا۔

میرے شیخ حضرت فضل علی شاہ قریشی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں موسیٰ زئی

شریف جا رہا تھا۔ میں سفر کے لئے گھر سے روٹی لے کر نکلا تھا۔ راستہ میں چند رفیق ہمراہ ہو گئے وہ بڑے آدمی تھے اور مرغن اور لذیذ غذائیں کھاتے تھے۔ مجھے کھانے کے لئے بلاتے مگر میں اپنے سوکھے ٹکڑوں پر قانع رہتا وہ آپس میں کہتے کہ دیکھو کیسا آدمی ہے کہ سوکھے ٹکڑے کھاتا ہے۔ کتنا بخیل ہے۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ مجھے اپنے ان سوکھے ٹکڑوں کے پاک اور حلال ہونے کا تو علم ہے۔ لیکن ان کی مرغن غذاؤں کی پاکی کا کوئی علم نہیں۔ میں نے کہا کہ تر کھانے سے نفس خوش ہوتا اور پاک کھانے سے رب تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔

میرے شیخ حضرت قریشی قدس سرہٗ العزیز کا یہ حال تھا کہ جب حضرت مولانا محمد سعید صاحبؒ مجھے ان کی خدمت میں لے کر گئے۔ تو آپ کی عمر ستر سال کی تھی، اور آپ ہل چلا رہے تھے۔ نیلے رنگ کا تہبند باندھ رکھا تھا۔ اور کرتہ شریعت کے مطابق تھا۔ حضرتؒ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے حالات دریافت کرنے کے بعد فرمایا مولانا آپ نازک مزاج ہیں۔ اور تھکے ہوئے آئے ہیں، آرام فرمائیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت نہ میں مولانا ہوں اور نہ مولوی۔ مجھے مولانا بنا دیں۔ اور خدمت کی اجازت دیں۔ ظہر کے بعد غسل کر کے میں بیعت ہوا۔ آپ نے فرمایا مولانا میں با وضو ہل چلاتا ہوں۔ اور جو غلہ پیدا ہوتا ہے میں گھر میں پسواتا ہوں۔ آٹا پیسنے کی مشین پر نہیں بھیجتا۔ تاکہ دوسروں کا آٹا نہ مل جائے۔ اس پاکیزہ غذا کا اہتمام کرتا ہوں۔ روٹی پکانے والے باوضو پکاتے ہیں۔ اور یہ روٹی فقیروں کو کھلاتا ہوں۔ دیکھئے تقویٰ کا کتنا اہتمام تھا۔

قلوب کا زنگ دور کرنا | فرمایا: حدیث شریف میں آیا ہے کہ خبردار یہ دل گناہوں سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ جیسے لوہے پر زنگ چڑھ جاتا ہے۔ اس زنگ کو دور کرنے والی، جلا دینے والی اور قلب کو روشن کرنے والی چیز موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآنِ مجید کی تلاوت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی قلب کو روشن کرتا ہے۔ لکل شیئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ۔

قلبِ مومن | واللہ قلبِ مومن بھی کوئی چیز ہے! اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر وسعت رکھی ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ نہ میں زمین میں سما سکتا ہوں۔ نہ آسمانوں میں۔ بلکہ قلبِ مومن میں سما سکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی وسعت رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تین عالم بنائے ہیں، ایک عالم کبیر وہ ہے زمین اور آسمان وما فیہما۔ دوسرا عالم صغیر۔ وہ ہے وجودِ انسانی۔ تیسرا عالم اصغر، وہ قلبِ مومن ہے۔ دیکھنے میں تو قلبِ مومن سب سے اصغر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی تنگ دلی نہ رکھنی چاہیئے۔

کعبہ بنیاد خلیل آذر است
دل گذرگاہ جلیل اکبر است
دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر | فرمایا: میرے ہاں دو چیزیں ہیں جن کی میں تعلیم دیتا ہوں —
۱۔ امر بالمعروف۔ ۲۔ نہی عن المنکر۔ امر بالمعروف تو سہل ہے۔ لیکن نہی عن المنکر مشکل ہے۔ اس کی تعلیم کوئی کوئی دیتا ہے۔ الحمدللہ تبلیغی جماعت سے وابستہ حضرات بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

دیکھو مسلمانو! دنیا وسیع (میل کچیل) ہے۔ یہ میل کچیل ہر انسان کو میلا کرتی ہے۔ جو لوگ لندن جاتے ہیں وہ کوٹ اور بوٹ سوٹ پہن کر جاتے ہیں۔ انگریزوں کا لباس ان کو خوش کرنے کی غرض سے پہن کر جاتے ہیں۔ حضرت آقائے نامدار رحمۃ العالمین کے طفیل ہمیں دنیا کی تمام نعمتیں ملی ہیں، اسلام ملا ہے۔ شریعت مطہرہ ملی ہے۔ افسوس ہے کہ آپؐ کو خوش کرنے کی ہم کوشش نہیں کرتے۔ کوٹ پتلون پہنتے ہیں۔ کھانا چھری کانٹوں کے ساتھ میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہماری سب چال ڈھال انگریزی نمونے کی ہے۔

ہمارے سب اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ ذرا خیال کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہم نے اعداء اللہ کی عادات کو پکڑ رکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات اور اخلاق کو چھوڑ رکھا ہے۔

نہی عن المنکر کی تعلیم دینا بہت مشکل ہے۔ میرا کام نصیحت کرنا ہے۔ اگر عمل کروگے تو تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ اگر میں حق بات نہ کہوں گا تو خائن بنوں گا۔

حافظ وظیفۂ تو فقط گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ شنید یا نہ شنید

مجھے آپ کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں ہر حال میں خوش ہوں۔ مجھے دال اور لسی ملے تو خوش ہوں، سادگی مجھے زیادہ پسند ہے۔

(باقی آئندہ)

٭٭٭

احوال وکوائف

زندگی اور اسکے تمام مشاغل کا مقصد رضائے الٰہی ہونا چاہیئے

دارالعلوم حقانیہ کے طلباء سے صاحبزادۂ شیخ الاسلامؒ مولانا اسعد مدنی کا خطاب

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے صاحبزادہ حضرت مولانا محمد اسعد مدنی مدظلہٗ سفر حجاز سے واپسی پر مختصر دورہ پر احباب اور متوسلین شیخؒ کی خواہش اور تقاضوں پر چند دن کے لئے پاکستان تشریف لائے کراچی سے دین پور، ملتان، سرگودھا، راولپنڈی ہوتے ہوئے ۲۲ مارچ اتوار کی شام کو دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے۔ تمام طلباء و اساتذۂ دارالعلوم چشم براہ تھے۔ یہاں سے آپ مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ اسیر مالٹا کی زیارت کیلئے سخاکوٹ چلے گئے دوسرے دن بروز پیر حسب پروگرام واپسی پر بعد از نماز عصر دوبارہ دارالعلوم تشریف لائے، مشتاقانِ دید کا ایک جم غفیر جو طلباء و اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ دور دراز سے آئے ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے تلامذہ علماء معتقدین پر مشتمل تھا دارالعلوم سے باہر دیدہ و دل فرشِ راہ کئے کھڑا تھا۔ حضرت صاحبزادہ گرامی قدر نے تمام طلبا اور حاضرین سے مصافحہ کیا اور اس کے بعد دارالعلوم کے مختلف شعبوں کو سرسری دیکھا۔ مغرب کی نماز معزز مہمان کی اقتداء میں پڑھی گئی۔ نماز مغرب کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ نے مختصر تقریر میں حضرت مولانا کی تشریف آوری پر خداوند کریم کا شکر ادا کرتے ہوئے مولانا کا نہایت مؤثر الفاظ میں خیر مقدم کیا۔ اور اس ضمن میں حضرت مدنی مرحوم کے کمالات ظاہری و معنوی کو بیان کرتے ہوئے مولانا اسعد مدظلہٗ کی بلند ہمتی، جذبۂ عمل اور علمی و عملی کمالات پر خوشی ظاہر کی جس کے جواب میں قابلِ احترام مہمان نے حسب ذیل مختصر مگر بصیرت افروز خطاب سے حاضرین کو نوازا۔ " ادارہ "

★

نحمدہٗ و نصلی ــــ الخ معزز حضرات علماء کرام و طلباء عزیز! میں ایک غیر ملکی ہوں اس لئے مجھ جیسے آدمی کو کسی بھی تقریر وغیرہ سے بہت احتیاط مناسب ہے۔ میں نے پچھلے سفر میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایسا کوئی موقع نہ آئے، مثلاً ملتان میں جلسہ کا اعلان ہوا۔ میری بے خبری میں پوسٹر

میں میرا نام بھی چھاپ دیا گیا بڑے پارک میں ہزاروں کا مجمع تھا، مگر میں نے جمعہ کی نماز پڑھ کر بظاہر بہت نامناسب طریقہ سے وہاں سے چلا آیا۔ اس لئے میرے لئے مناسب ہے کہ کسی بھی اجتماع سے تقریر یا خطاب نہ کروں یہاں سب مجمع اہل علم اور طالب العلم بھائیوں کا ہے اور ان سے خطاب کرنا تو مجھ جیسے طالب العلم کے لئے اور بھی نامناسب ہے۔

حضرت مولانا مدظلہم نے مجھ جیسے ناکارہ کے بارہ میں نہ معلوم کن وجوہ سے حسن ظن کا اظہار فرمایا آپ طلبہ حضرات کی طرح مجھے بھی حضرت مولانا مدظلہم سے (دیوبند میں) شرف تلمذ حاصل ہے اور مجھ جیسے ناکارہ کو تو زیبا بھی نہیں کہ آپ سے یہ نسبت بھی قائم کرسکوں۔ بہرحال یہ ان حضرات کی حوصلہ افزائی اور ذرہ نوازی ہوتی ہے۔ مجھ جیسے ناکارہ کے بارہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ) سے نسبت کی وجہ سے عموماً لوگ میرے بارہ میں بھی غلو کرتے ہیں تو تکلیف ہوتی ہے بہرحال یہ ان حضرات کا حسن ظن ہے، ورنہ مجھ جیسے شخص کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوسکتی اس لئے حضرت مرحوم کو مجھ پر قیاس نہ کریں۔ دنیا سے سب کو جانا ہے دنیا کا کام چلتا رہے گا۔ جیسے جیسے خیر اٹھتا جاتا ہے، شر بڑھتا جاتا ہے لوگ غلو بھی کرتے ہیں محبت میں اور شہرتیں بھی ہوجاتی ہیں، ورنہ کسی کے بس میں نہ لینا ہے اور نہ دینا ہے۔ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہتا ہے کرتا اور کرواتا ہے۔ دیتا اور دلاتا ہے۔ سب اس کے قبضہ کی چیز ہے وہ جس چیز کو چاہے بڑھا دیتا ہے۔ حسن ظن کروا دیتا ہے۔ اور اگر ان کی پردہ پوشی نہ ہوتی تو ہم جیسوں کو تو شاید کتے سے بھی برا سمجھ لیا جاتا۔

بہرحال ایک ہی بات عرض کرنی ہے۔ جو میرے لائق تو نہیں کہ عرض کروں کہ آپ حضرات خود طلباء علم ہیں، علوم الٰہیہ سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہے۔ اور اس کا یہی مطلب سمجھنا چاہئے کہ آپ اس مقصد میں اپنی زندگی بھی صرف کریں۔ قیاس کا یہی تقاضا ہے اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماوے تو سب سے اہم چیز یہ ہے کہ زندگی کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو اگر اس کے علاوہ کوئی بھی چیز ہو تو سب ماسوی اللہ ہے اور کوئی بھی ایسی چیز مقصد بن جائے تو وہ ساری جد و جہد تمنا اور کوشش سب غیر اللہ کے لئے ہوگی اللہ کیلئے نہیں، اور اس عالم میں سب مشاغل اور مصروفیات غیر اللہ کے لئے ہوجائیں گی اور جو بھی اللہ کے علاوہ مقصود بنے وہ کسی قابل نہیں آخر میں پچھتانا ہوگا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا، اور حضرتؒ سے بھی سنا، درس میں بھی سنایا کرتے تھے کہ ایک بہت ہی بڑے ترکی محدث تھے کبھی کبھی درد بھرے لہجے میں کہتے تھے کہ "چوبان دُردی چالدی

ترکی جملہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ چرواہا بانسری بجا کر چلا گیا۔ بہت حسرت کرتے اور روتے تھے لوگوں نے بے تکلفی میں پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں اور یہ کہہ کر آپ پر گریہ کیوں طاری ہو جاتا ہے۔ تو کہا کہ ایک شب میں جا رہا تھا کسی ساتھی نے کہا کہ آثار سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج رات شاید شب قدر ہے اور کہا کہ کوئی حسرت ہو تو آج رات دعا مانگ لی جائے، میں نے بھی آثار محسوس کئے تو میرے ساتھی نے اور میں نے اپنے لئے دعائیں مانگیں۔ صبح ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا مانگا تو ساتھی نے جو چرواہا تھا کہا کہ میں نے تو اللہ سے ایک ہی سوال کیا کہ الہ العالمین میرا خاتمہ ایمان پر فرما اور خود اسی بزرگ نے کہا کہ میں نے دعا کی کہ میرے حلقۂ درس سے کسی کا حلقہ بڑا نہ ہو۔ تو فرمایا کہ میں نے چرواہے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اللہ کا نام لیکر دنیا سے رخصت ہوا۔ اور مجھے بھی علم کا ایک بہت بڑا حلقہ ملا کہ کسی کا حلقہ بھی مجھ سے بڑا نہیں، مگر مجھے معلوم نہیں کہ آخرت کا کیا بنے گا۔ اور اس شہرت سے مجھے کیا ملا۔ اس لئے مجھے حسرت ہے کہ وہ جاہل چرواہا کامیاب ہو گیا اور مجھے اپنے حالات کا علم نہیں۔ اس بات کا صدمہ ہے اور دل میں ہُوک اٹھتی ہے۔ کہ دنیا سے کیسے اٹھوں گا۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ کوئی عمل کسی درجہ کا بھی ہو اگر اس میں رضائے الٰہی نہ ہو تو سب بیکار ہے اور اگر مقصد رضائے الٰہی بن جائے تو اس عمل کا بدلہ بھی کوئی عمل نہیں بن سکتا۔ اور یہ چیز خدا کے فضل سے ملتی ہے۔ اللہ کا فضل کسی پر ہوتا ہے، تب وہ پہنچتا ہے، لیکن کوشش سے اللہ کا فضل ہوتا ہے۔ ہمارا آپکا کام اتنا ہے کہ ہم سے جتنی کوشش ہو سکے کریں وہ کسی کو محروم نہیں کرتا۔

محترم بھائیو! آپ حضرات تو علماء کرام ہیں، میں ایک پردیسی ہوں، نہ تقریر کر سکتا ہوں نہ مجھے کچھ آتا ہے۔ اتنا عرض ہے کہ اپنی زندگی کو خدا سے لگانے اور بنانے میں خرچ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو دنیا بھی دین بن جائے گی۔ ورنہ خدانخواستہ خطرہ ہوگا کہ کہیں دین بھی دنیا نہ بن جائے۔

میں پھر ایک بار عرض کرتا ہوں کہ میں ایک طالب العلم ہوں نہ علم ہے نہ صلاح و تقویٰ ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

تو اس لئے میں آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور اس خلوص و محبت پر آپ سب کا شکر گزار بھی ــــ اللہ تعالیٰ مجھے آپ سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے اور ہمارے عیوب اور خرابیوں کو دُور فرما دے۔ آمین۔

~~~★~~~
~~~

·SANFORIZED·
پیروں کے
علاوہ

FOUNTAIN
BRAND
D. M. TEXTILE MILLS LTD